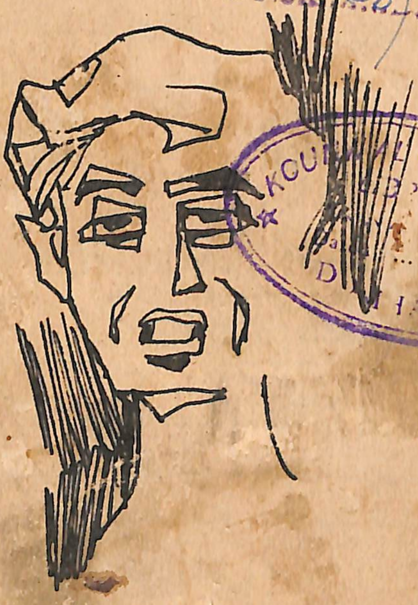
Bought on 22 Dec. 1975

بک رہا ہوں جنوں میں

پرکاش پنڈت



ترتیب

BAK RAHA HUN JUNUN MEN

HUMOUR AND SATIRE

PRAKASH PANDIT

قیمت: دو روپے

بک رہا ہوں جنوں میں....

● لکھو کہ میں تمہیں لکھواتا ہوں ——— بیکاری، بے روزگاری اور فاقوں سے عاجز آکر اگر تم ندی میں ڈوبنے جا رہے ہو تو ندی میں کودنے سے پہلے دیکھو، کوئی دھرماتما نہا تو نہیں رہا۔ اگر نہا رہا ہے تو کنارے پر پڑے ہوئے اس کے کپڑے لے کر چمپت ہو جاؤ، کیونکہ آج کی نسبت کل مرنا زیادہ بہتر ہے۔

● لکھو کہ ——— تمہارے قبضے میں کوئی زمین نہیں ہے، بلکہ تم زمین کے قبضے میں ہو۔ کل تمہاری اولاد بھی اسی زمین کے قبضے میں ہوگی جو تمہاری ہی طرح ایڑیاں اُچھال اُچھال کر کہتی پھرے گی ——— یہ زمین میری ہے!

● لکھو کہ ——— اپنے بزرگوں کا ہر حکم ہرگز نہیں مانوگے، ورنہ دنیا میں کوئی نیا فلسفۂ حیات پیدا نہیں ہوگا۔ آنکھیں بند کرکے سرِ تسلیم خم کر دوگے تو جنگلوں بیابانوں کی خاک چھانوگے۔ بیوی کو کوئی راون اُٹھالے جائے گا اور خود سرجو ندی میں ڈوب کر مروگے۔

● لکھو کہ ——— ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے دس تو کیا اگر تمہیں سو جھوٹ بھی بولنے پڑیں تو بے دریغ بولوگے۔ کیونکہ اگر ایک بار تمہارا اعتبار اُٹھ گیا تو جنگل کا شیر تمہاری بھیڑ بکریوں سمیت تمہیں بھی کھا جائے گا۔

آپ سے ملیے

آپ کا کوئی دوست اپنے کسی دوست سے آپ کا تعارف کراتا ہے۔
"آپ سے ملیے!"
اور آپ بغیر سوچے سمجھے کہ اس سے مل کر آپ کو واقعی خوشی ہوئی ہے یا افسوس، یا اگر اب خوشی ہوئی ہے تو آئندہ افسوس ہوگا، فوراً اپنی خوشی کا اظہار کر دیتے ہیں ——— "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"
آج سے چند ماہ پہلے میں بھی ہر شخص سے ملتے ہوئے بے ساختہ اس خوشی کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ وہ کوئی پٹواری ہو یا شاعر، اس کی کپڑے کی دکان ہو یا کوکین کا دھندا، مجھے اس سے مل کر بہت خوشی ہوتی تھی۔ اور ایسے لوگوں سے مل کر تو اب بھی بہت خوشی ہوتی ہے جن سے آئندہ ملاقات کا کوئی امکان نہ ہو۔ لیکن اسے میری بے ادبی کہہ لیجئے یا بداخلاقی کہ اب مجھ سے ملتے ہوئے جب کوئی یہ فقرہ ادا کرتا ہے کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی تو مجھے خوشی کی بجائے دحشت ہونے لگتی ہے۔ اور خدانخواستہ اگر اس کے دوبارہ ملنے کا کوئی امکان نظر آجائے تو میں صاف الفاظ میں کہہ دیتا

● لکھو کہ —— تمہارا حقیقی دوست وہ ہے جو مصیبت کے وقت تمہیں جوتے مارے تاکہ آئندہ دوستوں کے بھروسے پر تم نئی مصیبت مول لینے سے گریز کرو —— اور یہ بھی لکھو کہ تمہاری یہ مصیبت بغیر کسی دوست کی مدد کے کٹ جائے گی۔

● لکھو کہ —— تم نیکی کر کے ہرگز دریا میں نہیں ڈالو گے بلکہ اس سے پہلے جن احمقوں نے اُسے دریا میں ڈال رکھا ہے، اُسے نکال کر اپنے مصرف میں لانے کی کوشش کرو گے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ جہاں تک ممکن ہو، بدی کو بھی دریا برد ہونے سے بچاؤ کہ یہ دنیا صرف ضدوں کی وجہ سے خوبصورت اور زندہ رہنے کے قابل ہے۔

● لکھو کہ —— اگر تم ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا گال آگے کرو گے تو دوسرے پر بھی تھپڑ کھاؤ گے اور یاد رکھو کہ گال مادہ ہے اور تھپڑ انرجی!

● لکھو کہ —— جذباتیت اس دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ جذباتیت کی دوہائی دے کر بہت سے لوگ، جن میں تمہارے عزیز و اقارب بھی شامل ہیں تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہاتھی کی طرح کان پھٹکارتے اور جھومتے ہوئے نکل جاؤ کیونکہ کتے تو گدھے کو دیکھ کر بھی بھونکنے لگتے ہیں۔

● لکھو کہ —— میں تمہیں ریاضی کا ایک سوال لکھواتا ہوں اور خود ہی اس کا جواب بتاتا ہوں۔ گناہ کہاں ہے؟ جہاں ثواب نہیں۔ ثواب کہاں ہے؟ جہاں گناہ نہیں۔ تو پھر یہ دونوں کہاں ہیں؟ کہیں نہیں!

● لکھو کہ —— میں تمہیں لکھواتا ہوں کہ آج تک جس کسی نے تمہیں کچھ لکھوایا ہے وہ بے حد چالاک آدمی تھا اور اسی لیے چالاکی ہر مذہب کا جزوِ لاینفک ہے۔

"کمال ہے بھئی! ابھی تک سو رہے ہو؟"

دلّی آنے پر ہر مرتبہ نئے سرے سے انھیں میری گرتی ہوئی صحت کا الہام ہوتا ہے۔ صبح چار بجے اُٹھانے کے بعد وہ اپنے چار من وزنی بستر میں سے، جس میں پورے گھر کی رضائیوں، دُلائیوں، کھیسوں، تکیوں اور مختلف لباسوں کے علاوہ کچّے لوہے اور پکّے فولاد کی عجیب عجیب مشینیں بھری رہتی ہیں، وہ دو عدد لنگوٹ نکالتے ہیں اور سردی گرمی کی پروا کئے بغیر پہلے مجھ سے اپنے پورے جسم پر مالش کرواتے ہیں اور پھر اس طرح میری مالش کرتے ہیں کہ نظر تو یہ آتا ہے کہ مالش ہو رہی ہے۔ لیکن دراصل ہڈی پسلی ایک ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بہت ہی سنجیدگی سے وہ میری بیوی کے کان میں نہ جانے کیا پھونک مارتے ہیں کہ بس اسی لمحے سے میری بیوی کو میری گرتی ہوئی صحت کا غم کھانے لگتا ہے۔ اور میرے لاکھ منع کرنے پر بھی گھر میں بلا ناغہ باداموں کا حلوا بننے لگتا ہے۔ سالن میں اوپر سے اصلی گھی چھوڑا جاتا ہے۔ اور طرح طرح کے پھلوں کے ٹوکرے آنے لگتے ہیں۔ اور میرے وہ عزیز دوست خود اپنے ہاتھ سے پھلوں کا رس نکال نکال کر میرے حلق میں اتار دیتے ہیں۔ اور میرے اصرار پر خود بھی تھوڑا سا چکھ لیتے ہیں۔

قیام فرمانے اور پھلوں کا رس چکھنے تک نوبت رہتی، جب بھی میں کہتا کہ چلو بدلے میں مَیں بھی تھوڑی بہت خوشی کا اظہار کر دوں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان کے آتے ہی میری تمام تر حقیقی خوشیاں بھی اُڑن چھو ہو جاتی ہیں۔ میں تھکا ماندہ دفتر سے گھر لوٹا ہوں اور ذرا بچوں سے جی بہلانا چاہتا ہوں کہ آنجناب میرے لکھنے پڑھنے کے کمرے سے کوئی ٹوٹا ہوا گلدان، کسی تصویر کا ٹوٹا مڑا فریم، یا لوہے کی کمانیاں اور شیشے کی کرچیاں، جن کی

ہوں کہ صاحب مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔

میری اس بے ادبی یا بداخلاقی کا سبب میرے ایک نئے دوست ہیں، جن سے نہ جانے کس مسخرے نے الٰہ آباد میں میری ملاقات کرادی تھی۔ آپ ریگ مال بنانے والی ایک فیکٹری کے ٹورنگ ایجنٹ ہیں۔ اور مجھے اگرچہ ایجنٹ نام کی مخلوق سے ہمیشہ سے شدید نفرت رہی ہے۔ پھر بھی پہلی بار جب میری اُن سے ملاقات کرائی گئی تو حسب دستور مجھے اُن سے مل کر "بہت خوشی" ہوئی۔ آدمی بلا کے ذہین ہیں۔ اِس لئے جوں ہی اُن سے مل کر مجھے خوشی ہوئی انھوں نے فوراً میرا اتہ پتہ نوٹ کرلیا اور اُس دن سے آج تک میری اِس خوشی میں کسی طرح کی کمی نہیں آنے دی بلکہ آئے دن کی ملاقاتوں سے اِسے دوچند کر رہے ہیں۔ اپنے کام کے سلسلے میں انھیں اکثر دلّی آنا پڑتا ہے۔ اور جب بھی دلّی آتے ہیں سیدھے میرے یہاں آتے ہیں۔ اور جب تک دلّی میں قیام فرماتے ہیں میرے ہی یہاں فرماتے ہیں۔

گاڑی اُن کی عموماً رات کے دو بجے دلّی پہنچتی ہے۔ اور رات کے تین بجے میرے گھر پہنچنے پر سب سے پہلا کام وہ یہ کرتے ہیں کہ مجھے بستر سے کھینچ کر فرش پر کھڑا کر دیتے ہیں اور پھر اس طرح لپٹ لپٹ کے اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے میری خوشی کا سامان فراہم کرتے ہیں کہ اگر میرے جسم کی کوئی ہڈی ذرا کمزور ہوتی تو میرا گھر کبھی کا ہسپتال میں تبدیل ہو چکا ہوتا۔ اس کرمفرمائی کے بعد آپ بہت ہی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"کمال ہے بھئی! ابھی سے سو گئے؟"

اور صبح چار بجے اُٹھ کر اور مجھے بستر سے کھینچ کر فرش پر کھڑا کرنے کا عمل دُہرانے کے بعد اور بھی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

معاف کیجئے

"معاف کیجئے۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"معاف کیجئے وقت ہی ایسا آن پڑا ہے، ورنہ میں کبھی آپ سے قرض نہ مانگتا۔"

"معاف کیجئے میں اتنا بے وقوف نہیں کہ آپ کے جھانسے میں آجاؤں۔"

"معاف کیجئے آپ بڑے بدتمیز ہیں۔"

دو لفظوں کا یہ مجموعہ "معاف کیجئے" بظاہر دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اگر کبھی خدا نے آپ کو سوچنے کی فرصت یا توفیق دی تو میری طرح آپ کو بھی دو لفظوں کا یہ مجموعہ نہ صرف مجموعۂ اضداد نظر آئے گا بلکہ دن کو تارے نظر آنے لگیں گے۔

مجھے اگر دن کو تارے نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ کے مقابلے میں میری بینائی تیز ہے، یا ہر چیز کو میں دوربین یا خوردبین سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ میں کوئی عامل یا فوق البشر بھی نہیں ہوں کہ کسی عمل کے ذریعے دن کو رات میں تبدیل کر کے چپکے سے تارے دیکھ لیتا ہوں۔ جی نہیں، ایسی کوئی بات

صبح کی شکل ٹائم پیس کی تھی لیکر دار ہوں گے اور ایسا گھٹیا مال بنانے والی کمپنیوں کو تابڑ توڑ صلواتیں سنانے کے بعد مجھے چار میل پیدل گھسیٹ کر اس دکان پر لے جائیں گے جہاں سے چند روز پہلے میں نے وہ گارنٹی کی گھڑی خریدی تھی۔ پھر پینترے بدل بدل کر دکان دار سے لفظی دنگل کریں گے اور اس کے بعد لوہے کی ان کمانیوں اور شیشے کی کرچیوں کو وہیں پٹخ کر کہیں گے۔

"چھوڑیئے، لعنت بھیجئے۔ آئندہ جب کوئی چیز خریدنا ہو تو بغیر میرے مشورے کے ہرگز نہ خریدیئے۔"

خرید و فروخت کے بارے میں ہی نہیں، دنیا کی ہر چیز کے بارے میں مجھے مفید مشورہ دینا اور اس پر سختی سے عمل کرانا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ سب سے اہم اور مفید ترین مشورہ جو اب تک انھوں نے مجھے دیا ہے وہ یہ ہے کہ میں لکھنے پڑھنے کی بکواس چھوڑ کر سلولائیڈ کی کنگھیوں کی ایجنسی لے لوں۔ اور اس مشورے کی عملی صورت یہ ہے کہ ان کی موجودگی میں جب بھی میں کوئی مضمون وغیرہ لکھنے بیٹھتا ہوں وہ اچھل کر میرا مضمون اچک لیتے ہیں اور "جب تک میں یہاں ہوں یہ نہیں ہو سکتا، جب تک میں یہاں ہوں یہ نہیں ہو سکتا۔" کہتے ہوئے میرا مضمون ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیتے ہیں۔

"جب تک میں یہاں ہوں" شاید ان کا تکیہ کلام ہے۔ کیونکہ جب سے میری اُن سے ملاقات ہوئی ہے میں نے اکثر انھیں یہیں پایا ہے۔ ان دنوں بھی حضرت یہیں تشریف رکھتے ہیں اور سنا ہے آپ کا ارادہ اب مستقل طور پر یہیں تشریف رکھنے کا ہے۔ کیونکہ جب میرا ان سے تعارف ہوا تھا تو مجھے اُن سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی!

کہہ کر کالی مرچ اور دھنیے گرتی ہوئی قیمتوں کا رونا رونے کے ساتھ تلّی کے تیل کے فائدوں پر اتنا طویل لیکچر فرمانے لگتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ ———

"معاف کیجئے میں نے آپ کا وقت ضائع کیا!"

"معاف کیجئے آپ مصروف تھے!"

کہتے جاتے ہیں کہ جی چاہتا ہے، محترم کو بہ نفس نفیس اُٹھا کر گلی میں پٹخ دوں کہ "حضرت میری سو پُشتوں نے آپ کو معاف کیا۔ للّٰہ اب مجھے معاف کر دیجیے!" لیکن میں ایسا نہیں کہتا۔ انسان نے سینکڑوں ہزاروں برس کی کوششوں کے بعد تہذیب نامی ایک وصف ہی تو ایسا ایجاد کیا ہے جسے امیر غریب، بچے بوڑھے بلا امتیاز مذہب وملت زیادہ سے زیادہ مقدار میں حاصل کرنے کے متمنّی ہیں۔ مہذب قومیں تو "معاف کیجیے" کہنے پر قاتلوں تک کو معاف کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ میں اتنا گیا گزرا نہیں کہ ایک سیاہ یا سفید ریش بزرگ تک کو معاف نہ کر سکوں، جن کا یہ اصرار بھی ہو، کہ وہ میرے پڑوسی ہیں!

میں نے تو اُن بزرگوں کو بھی بارہا معاف کیا ہے جو واقعی میرے پڑوسی ہیں۔ اور ہر چوتھے چھٹے کسی نہ کسی چیز سے میرے غریب خانے کو پاک کرتے رہتے ہیں۔ ایک بار ایک بزرگ تشریف لائے اور "معاف کیجئے تھوڑی دیر کے لئے میں آپ کی سائیکل لے جا رہا ہوں" کہہ کر میری سائیکل لے گئے۔ سائیکل وہ واقعی تھوڑی دیر کے لئے لے گئے تھے۔ کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر اُنھوں نے کہا: "معاف کیجئے آپ کی سائیکل چوری ہو گئی ہے" ایک بار ایک اور بزرگ تشریف لائے اور کھڑے کھڑے بولے: "معاف کیجئے کل آپ کی اجازت کے بغیر ہی میں آپ کا گراموفون باجہ لے گیا تھا اور معاف

نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ خلا کے بجائے خدا کے نیک بندے آئے دن مجھے سوچنے کی فرصت اور توفیق عطا فرماتے رہتے ہیں۔

ایسا تو کئی بار ہو چکا ہے کہ مجھے ریل کا سفر درپیش ہے۔ رات کا وقت ہے۔ آرام کی خاطر توفیق سے زیادہ پیسے خرچ کر کے میں نے پوری سیٹ ریزرو کروا رکھی ہے اور بڑے اطمینان سے نیم دراز حالت میں لیٹا ہوا کوئی دلچسپ کتاب پڑھ رہا ہوں کہ یکایک جیسے زلزلہ آ جاتا ہے۔ اور دوسرے لمحے میں دیکھتا ہوں کہ میری ریزرو شدہ پوری سیٹ پر درجن بھر نونہالوں کو گود میں سمیٹے ایک والدۂ محترمہ پھسکڑا مارے بیٹھی ہیں اور ان درجن بھر نونہالوں کے والد بزرگوار —

"معاف کیجئے، آپ کو زحمت ہوئی"

کہہ کر میری گود میں بیٹھنے کے درپے ہیں۔

ایسا بھی کئی بار ہو چکا ہے کہ اپنے کمرے کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے میں کوئی مضمون لکھنے میں مصروف ہوں۔ اور بقول شخصے (میں ہی وہ شخص ہوں جس کا یہ قول ہے) کہ لکھنے والا صرف اُس وقت عظیم ہوتا ہے جب وہ لکھنے میں مصروف ہوتا ہے۔ خوبصورت جملے، خوبصورت تشبیہیں اُتر رہی ہیں۔ اور انھیں قلم بند کرتے ہوئے میں ایک روحانی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ اچانک دروازوں، کھڑکیوں پر جھپ تال بجنے لگتا ہے۔ اور دروازہ کھلنے پر کسی بھی شبیہ کے ایک بزرگ جنھیں خاکسار کو زندگی میں پہلی بار دیکھنے کا شرف حاصل ہوتا ہے، لیکن جن کا اصرار ہوتا ہے کہ میں انھیں اپنا پڑوسی سمجھوں، کمرے میں وارد ہوتے ہیں اور۔

"معاف کیجئے"

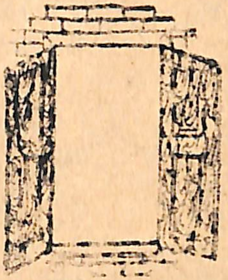
دُکھیا سب سنسار

جیسا کہ میں نے لکھا اور آپ نے پڑھا اور آج سے صدیوں پہلے گورو نانک نے لکھا تھا اور آپ آج تک پڑھ رہے ہیں۔ سب سنسار دُکھیا ہے۔ کسی کو روپے کے ہونے کا دُکھ ہے تو کسی کو روپے کے نہ ہونے کا۔ کوئی دُبلا ہے تو دُکھی ہے، موٹا ہے تو دُکھی ہے۔ اندھا اس لئے دُکھی ہے کہ وہ اندھا ہے اور جو اندھا نہیں اُسے اس بات کا دُکھ ہے کہ وہ اندھا کیوں نہیں ہو جاتا۔ کنوارے دُکھی اور شادی شدہ حضرات اُن سے زیادہ دُکھی ——لیکن سردست چونکہ میرے پاس سارے سنسار کے دُکھوں کی فہرست مرتب کرنے کا وقت نہیں، اس لئے سردست میں صرف اس مخلوق کے دُکھوں کا ذکر کروں گا جسے عام اصطلاح میں ادیب اور قاری کہا جاتا ہے۔

آپ کو شاید میرے ادیب ہونے میں شبہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے یا کم از کم میں اسے حقیقت سمجھتا ہوں کہ میں ایک ادیب ہوں اور میں اس لئے بھی اپنے آپ کو ایک ادیب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ دنیا کے ہر ادیب کی طرح مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ اگر میں نے لکھنا بند کر دیا تو پورا نظامِ قدرت

کیجیے آپ کا گراموفون باجہ بچوں نے توڑ ڈالا ہے" اور یہ کہہ کر کھڑے کھڑے واپس چلے گئے۔

سائیکل اور گراموفون باجہ ہی نہیں، غریب خانے کی ہر چیز اِس "معاف کیجیے" کی نذر ہو چکی ہے۔ کبھی غریب خانے پر صوفہ سیٹ تھے، بجلی کے پنکھے، قالین، ریڈیو، ریڈیو گرام، نایاب سے نایاب کتابوں سے بھری ہوئی شاندار لائبریری۔۔! کیا تھا جو غریب خانے پر نہیں تھا۔ لیکن اب اگر آپ غریب خانے پر تشریف لائیں تو آپ دیکھیں گے، معاف کیجیے، میرے علاوہ اب آپ غریب خانے پر کچھ نہ دیکھیں گے!



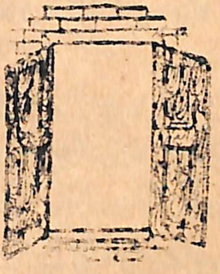
دُکھیا سب سنسار

جیسا کہ میں نے لکھا اور آپ نے پڑھا اور آج سے صدیوں پہلے گورو نانک نے لکھا تھا اور آپ آج تک پڑھ رہے ہیں۔ سب سنسار دُکھیا ہے۔ کسی کو روپے کے ہونے کا دُکھ ہے تو کسی کو روپے کے نہ ہونے کا۔ کوئی دُبلا ہے تو دُکھی ہے، موٹا ہے تو دُکھی ہے۔ اندھا اس لیئے دُکھی ہے کہ وہ اندھا ہے اور جو اندھا نہیں اُسے اس بات کا دُکھ ہے کہ وہ اندھا کیوں نہیں ہو جاتا۔ کنوارے دُکھی اور شادی شدہ حضرات اُن سے زیادہ دُکھی — لیکن سر دست چونکہ میرے پاس سارے سنسار کے دُکھوں کی فہرست مرتب کرنے کا وقت نہیں، اِس لیئے سر دست میں صرف اس مخلوق کے دُکھوں کا ذکر کروں گا جسے عام اصطلاح میں ادیب اور قاری کہا جاتا ہے۔

آپ کو شاید میرے ادیب ہونے میں شبہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے یا کم از کم میں اسے حقیقت سمجھتا ہوں کہ میں ایک ادیب ہوں اور میں اس لیئے بھی اپنے آپ کو ایک ادیب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ دنیا کے ہر ادیب کی طرح مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ اگر میں نے لکھنا بند کر دیا تو پورا نظامِ قدرت

کیجیے آپ کا گراموفون باجہ بچّوں نے توڑ ڈالا ہے" اور یہ کہہ کر کھڑے کھڑے واپس چلے گئے۔

سائیکل اور گراموفون باجہ ہی نہیں، غریب خانے کی ہر چیز اِس "معاف کیجیے" کی نذر ہو چکی ہے۔ کبھی غریب خانے پر صوفہ سیٹ تھے، بجلی کے پنکھے، قالین، ریڈیو، ریڈیو گرام، نایاب سے نایاب کتابوں سے بھری ہوئی شاندار لائبریری --! کیا تھا جو غریب خانے پر نہیں تھا۔ لیکن اب اگر آپ غریب خانے پر تشریف لائیں تو آپ دیکھیں گے، معاف کیجیے، میرے علاوہ اب آپ غریب خانے پر کچھ نہ دیکھیں گے!



قسم کی چیز ہوتا ہے۔ جس دنیا میں وہ رہتا ہے اس میں بیوی بچے اور اُن کے خالی پیٹ نہیں، حورانِ عرشِ بریں اور شہد اور دودھ کی ندیاں ہوتی ہیں۔ اُس کا معدہ دانۂ گندم سے واقف ہوتا ہے، نہ اس کا حاجت مند، اور حورانِ عرشِ بریں کا تو ہم سب نے سُن رکھا ہے کہ معدہ ہی نہیں ہوتا اس کے اِک ذرا زبان ہلانے پر دنیا جہان کی آسائشیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہوجاتی ہیں۔ اور اِک ذرا قلم گھسانے پر اس کا شہرہ چہار دانگ عالم میں پھیل جاتا ہے۔ یہ جاننے کی آپ کو قطعی ضرورت نہیں کہ اس کی لکھی کتابوں کی مقبولیت کا عالم کیا ہے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ چھ سال میں اُن کی صرف چھ جلدیں فروخت ہوئی ہوں اور اُن کی رائیلٹی کے لئے ناشر کے یہاں چھ سو چکر لگانے کے بعد اُسے بتایا جاتا ہو کہ چونکہ رجسٹروں میں ان کتابوں کی فروخت کا اندراج یا سراغ نہیں ملتا، اس لئے پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کتابیں فروخت نہیں، چوری ہوئی ہیں۔

ادیب اور قاری کے رشتے کی طرح ادیب اور ناشر کا رشتہ بھی چولی دامن کا رشتہ ہے بلکہ ادیب، قاری اور ناشر تینوں ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار ہیں جو قریبی رشتہ داروں کی طرح منہ کے میٹھے اور دل کے کھوٹے ہونے پر بھی ایک دوسرے کا جزِ لاینفک ہیں۔ ناشر جانتا ہے کہ قاری نہ رہا تو وہ بھی نہ رہے گا۔ قاری جانتا ہے کہ ادیب نہ رہا تو وہ بھی نہ رہے گا اور ادیب جانتا ہے کہ اگر قاری اور ناشر نہ رہے تو نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری لہٰذا یہ تینوں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے ایک دوسرے کا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ خود دکھ اُٹھاتے ہیں اور دوسروں کو دکھ پہنچاتے ہیں۔

آپ چونکہ قاری ہیں اور بفرضِ محال نہیں ہیں تو اس وقت مجھے فرض

درہم برہم ہو جائے گا اور دنیا میرے زریں اور الہامی اقوال سے محروم ہو جائے گی۔ چنانچہ نظامِ قدرت کو برقرار رکھنے اور دنیا کو اپنے زریں اور الہامی اقوال سے مالا مال کرنے کے لئے میں اپنے کتب خانے میں، جو بیک وقت کتب خانہ، باورچی خانہ اور غسل خانہ ہے۔ مسائلِ تصوف بیان کر کر کے اپنے ولی ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا رہتا ہوں۔

کتب خانہ، باورچی خانہ اور غسل خانہ، ایک خانے میں ان تینوں خانوں کا ذکر سن کر اگر آپ ادیب نہیں ہیں، تو ضرور چونکے ہوں گے اور اگر نہیں چونکے تو میرا آپ سے اصرار ہے کہ چونکئے بلکہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو چونکائیے، ورنہ اس زمانے کا سب سے بڑا اعزاز یعنی آپ کے قاری ہونے کا اعزاز خطرے میں پڑ جائے گا۔ ادیب کے بارے میں قاری کا جو تصور ہوتا ہے وہ اس تصور سے قطعی مختلف نہیں، جو مرلی منوہر کے بارے میں میرا کا تھا، یا شیریں کے بارے میں تیشہ زن کا۔ نئی زمانہ محل نہیں رہے، قلعے اور چوبدار نہیں رہے لیکن بنگلے، کاریں، نوکر چاکر ایسی دسیوں چیزیں وجود میں آ چکی ہیں، جنھیں عاشق اپنے محبوب سے اور قاری ادیب سے منسوب کر سکتے ہیں۔ "کر سکتے ہیں" میں نے اس لئے کہا کیونکہ ادیب سے ان چیزوں کو صرف منسوب ہی کیا جا سکتا ہے، ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے یہ صرف ادیب نامی بندہ بے دام ہی جانتا ہے کہ کس طرح اس کے بیوی بچے اپنا خالی پیٹ بجا بجا کر اس سے لکھنے پڑھنے کے کرتب چھوڑنے اور دہی بڑوں کا کھونچہ لگانے کی التجائیں کیا کرتے ہیں۔

ادیب کے بیوی بچوں کے نام پر آپ ایک بار پھر چونکئے۔ کیونکہ قاری کے نزدیک ادیب اس قسم کی دنیاوی خرافات سے بلند و بالا ایک ماورائی

ٹوٹ جائے گا۔ وہ مہاشے فوراً آپ کی کتاب اُچک لیں گے اور اس وقت تک واپس نہیں کریں گے جب تک آپ منزلِ مقصود پر پہنچ کر اُن سے جسمانی طور پر نہیں چھین لیتے۔

یہ تو ہوئی آپ کی یعنی قاری کی بات، اب ذرا اس کتاب کے مصنف یعنی ادیب کی بات سنئیے۔ بیچارے ادیب نے چھ مہینے کی محنت شاقہ اور مسلسل فاقہ کے بعد ایک ناول لکھا اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے اس کا خیال تھا اور بعد میں یہ خیال صحیح بھی ثابت ہوا کہ ایسی کتاب نہ آج تک لکھی گئی ہے نہ آئندہ لکھی جانے کا کوئی امکان ہے۔ چنانچہ بڑے فخر اور بڑی خود اعتمادی کے ساتھ وہ ناشر کے یہاں پہنچا۔ ناشر کے خیال شریف میں وہ زمانہ ناولوں کا نہیں، ٹیکنیکل کتابوں کا زمانہ تھا۔ مسودے کو الٹ پلٹ کر ہاتھوں کے ترازو میں تول کر، سونگھ کر اور جھینک کر وہ اُسے لوٹانا ہی چاہتا تھا کہ ناگاہ ایک جگہ اس کی چشم بدوُور لفظ گاجر پر پڑ گئی۔ ادیب کو اُس نے مشورہ دیا اور کتاب چھپوانے کی غرض سے ادیب نے اس مشورے کو بسر و چشم قبول کیا کہ جس جگہ گاجر کا ذکر ہے وہاں اگر گاجر کی قسمیں لکھوا دی جائیں تو کتاب زیادہ مستند ہو جائے گی۔ ادیب نے گاجر کی قسموں کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو مہربان ناشر نے اس کام کو اپنے ذمے لے کر کسی ہر فن مولا سے نہ صرف اس میں گاجر کی قسموں کا اضافہ کروا لیا بلکہ جہاں لفظ مچھر آیا وہاں مچھر کی اور جہاں کسی لباس کا ذکر آیا وہاں مختلف لباسوں کی بالتصویر اور بالتفصیل تشریح کرالی اور یوں وہ ناول ایک پُر از معلومات انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں آپ تک پہنچا۔ آپ کا تو جو حال ہوا سو ہوا ادیب پر اس سانحے کے بعد کیا گزری ہوگی اسے صرف اس کے پڑوسی ہی جان سکتے

فرض کر لیجئے کہ ہیں اور آپ کو کسی شادی یا مرگ کے سلسلے میں دور دراز کا سفر درپیش ہے اور چونکہ اکثر و بیشتر کتابیں سفر میں پڑھی اور گھر میں پھاڑی جاتی ہیں اس لئے آپ نے ریلوے بک سٹال سے اپنے پسندیدہ ادیب کا ناول خرید لیا۔ اب آپ مطمئن ہیں کہ وقت بھی کٹ جائے گا سفر کی کوفت بھی نہیں ہوگی اور ایک ناول کا مطالعہ بھی ہو جائے گا کہ جس کا صرف تبصرہ پڑھ کر آپ اپنے دوستوں پر اپنے وسیع مطالعہ کی دھاک جمانے کی کوشش کرتے۔ گاڑی روانہ ہوئی اور آپ نے بڑے اطمینان سے ٹانگیں پسار کر وہ ناول کھولا۔ پہلا صفحہ، دوسرا صفحہ، بیسواں صفحہ —— یا الٰہی خیر، یہ ناول ہے یا اچار مربّہ ڈالنے کی مختلف ترکیبوں کا مجموعہ؟ جبر کر کے آپ نے چند صفحے اور پڑھ ڈالے۔ اب ہر صفحے کے بعد کتاب کی صنف کے بارے میں آپ پر نیا انکشاف ہو رہا ہے۔ کہیں کسی قتل کے مقدمہ کی روئیداد درج ہے تو کہیں بچوں کی نفسیات پر مدلل بحث۔ چند صفحوں پر کپڑوں کی کٹائی سلائی کے نمونے پھیلے ہوئے ہیں تو چند صفحوں پر ملیریا سے بچنے کے آسان نسخے اور فسکار کھیلنے کی احتیاطی تدبیریں۔ لیکن آپ اسے ناول سمجھنے اور شروع سے آخر تک پڑھنے پر مجبور ہیں۔ ایک تو آپ نے اس پر اپنے خون پسینے کی کمائی صرف کی ہے، پھر اس وقت کوئی اور ذریعہ دل بہلانے کا آپ کے پاس نہیں۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے سامنے کی سیٹ پر بیٹھا ایک قہر درویش برجان درویش قسم کا شخص جو صورت سے بھی قاری معلوم ہوتا ہے اور سیرت سے بھی، بڑی للچائی نظروں سے آپ کی کتاب کی طرف دیکھ رہا ہے اور آپ جانتے ہیں اور آپ کو اس کا تجربہ بھی ہے کہ اگر آپ نے کتاب بند کر دی تو یہ ہوگا کہ بلی کے بھاگوں چھینکا

دفتر سے چھٹیاں لے لے کے اپنی خوش و خرم زندگی کو جہنم زار بنا دیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ادیب کے دکھوں کا کوئی شمار ہے نہ قاری کے۔ ادیب اگر لکھتا نہیں تو اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا اور اگر لکھتا ہے تو ہضم کرنے کے لئے کھانا نہیں ملتا۔ قاری اگر پڑھتا نہیں تو اسے اپنی زندگی ادھوری ادھوری سی محسوس ہوتی ہے اور پڑھتا ہے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ بہ تہ بعض دکھ اگر حقیقی دکھ ہیں تو بعض محض اتفاقیہ۔ بعض بلائے بے درماں کی طرح نازل ہوتے ہیں تو بعضوں کو آواز دے کر گھر بلایا جاتا ہے اور گھر آئے مہمان کو جا ہے وہ بلایا ہوا ہو یا بن بلایا کوئی احمق ہی ہوگا، جو دھتکارے گا۔ ادیب اور قاری چونکہ احمق نہیں ہوتے یا کم از کم احمق کہلوانا پسند نہیں کرتے اس لئے ایک حال مست رہتا ہے تو دوسرا مال مست۔ ادیب اپنی کتاب کے صفحوں میں پنساری کو خشخاش اور دار چینی کی پڑیاں باندھتے دیکھ رہا ہے، لیکن وہ مست ہے۔ قاری کی خریدی ہوئی کتاب کا ہر صفحہ بلکہ ہر سطر نیند آور گولی کا کام دے رہی ہے لیکن وہ مست ہے اور اس لئے مست ہے کیونکہ سوائے رہ رہ کے مست ہونے کے اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں، اور چارہ کار اس لئے نہیں کیونکہ وہ ؎

اُسی کو دیکھ کر جیتا ہے جس کافر پہ دم نکلے

ہیں۔

اگر آپ چاہیں تو اس قسم کے دکھوں کو اتفاقیہ دکھ کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ رفتار سے قطع نظر عورتیں مردوں میں اور ناول انسائیکلوپیڈیا میں اتفاق ہی سے تبدیل ہوتے ہیں۔ آپ کسی ایسے ناول کو لیجئے جو واقعتاً ناول تھا، ہے اور رہے گا۔ آپ نے اس کا مطالعہ شروع کیا اور بقول مشتہرین آپ کے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ کچھ ادیب کے زور بیان سے اور کچھ پرانی یادوں کے ابھر آنے سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ناول کے ہیرو ہیں اور آپ ہیں اور ناول کی ہیروئن میں اور آپ کی دیرینہ محبوبہ اور حالیہ بیوی میں سوائے شکل و صورت کے کوئی فرق نہیں۔ حالات وہی ہیں جو تھے، حادثات بھی وہی ہیں جو تھے۔ یہاں تک کہ انجام بھی وہی ہوا جو آپ کا ہوا تھا۔ یعنی ہزار دقتوں، دشواریوں کے بعد آپ سہرا باندھ کر اپنی محبوبہ کو بیاہ لائے اور اب نہایت خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں کہ ایکا ایک آپ کا چہرہ فق ہو جاتا ہے، ایک رنگ جاتا ہے اور آتا کوئی بھی نہیں، کیونکہ جو دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ، پر عمل کرتے ہوئے آپ نے بار بار دیکھا کہ ناول کی ہیروئن شادی کے چند ماہ بعد ہی ہیرو یعنی اپنے شوہر سے متنفر ہوگئی۔ اپنی نفرت کا تو وہ اظہار نہیں کرتی لیکن ہیرو یعنی شوہر کے دفتر چلے جانے کے بعد اپنے ایک پرانے عاشق کو خطوط لکھتی ہے اس کی یاد میں آنسو بہاتی ہے اور لگاہے گاہے وہ ایک دوسرے سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔ اس صورت میں آپ ہی بتائیے کہ اس میں آپ کا اور ناول کے مصنف کا کیا قصور تھا کہ مصنف کو جتنی گالیاں آپ دے سکتے تھے افسر کی دھمکی کے ساتھ آپ نے لکھ بھیجیں اور بیوی پہ خواہ مخواہ خفا ہو کر کے اور

میں دنگل کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا، روتے گاتے گھر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ آنحضرت نے پچھاڑ کھائے ہوئے ایک پہلوان پہ کوئی پھبتی کس دی تھی جس کی داد محترم پہلوان نے ان کی پسلی پر ایک عدد گھونسا جما کر دی۔ گھونسا چونکہ داد کے طور پر عطا ہوا تھا، اس لئے ایمبولنس کار کے بجائے صرف اسٹریچر کی ضرورت پڑی۔ ظاہر ہے کہ ان کی جگہ اگر ہم وہاں ہوتے تو براہ راست مردہ گاڑی کی ضرورت پڑتی۔ لیکن عزیز کی حالت غیر دیکھ کر ہمارا چہرہ تمتما اٹھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ چھاتی پھلانے سے ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں۔ اور آستینیں چڑھاتے ہوئے بیساختہ ہمارے منہ سے نکل گیا —— ہم نہ ہوئے وہاں!

"ہم نہ ہوئے وہاں"، ایک انتہائی بے ضرر اور کارآمد جملہ ہے جس کے ذریعے ہینگ پھٹکری کے بغیر چوکھا رنگ لایا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر آپ چاہیں تو ذرا سی احتیاط کے ساتھ یہ جملہ ادا کر کے اپنی جواں مردی اور بیباکی اپنے وسیع تعلقات اور اپنی وسیع معلومات کی دھاک جما سکتے ہیں۔ زندگی میں چاہے آپ سے ایک ٹڈی تک نہ مری ہو مگر شیر کے شکار کی روئیداد سن کر اور یہ سن کر کہ گولیاں تو بہت چلیں مگر سب کی سب خطا گئیں، آپ بڑی دلیری بلکہ دیدہ دلیری سے "ہم نہ ہوئے وہاں" کہہ کر تیس مار خاں کا خطاب حاصل کر سکتے ہیں۔ یا پھر خود شعر کہنا تو در کنار آپ کو دوسروں کے شعر چرانے کا بھی سلیقہ نہیں۔ میر یا غالب کی غزل کو اپنی غزل کہہ کر پیش کرتے ہوئے آپ اکثر غزل کا مقطع بھی سنا جاتے ہیں کہ جس میں شاعر کا تخلص موجود ہوتا ہے اور لگا تو آپ کا پیدائشی ہی سے ایسا ہے کہ گونگوں کے علاوہ شاید ہی کوئی جانور آپ کی آواز سے مانوس ہو۔ مگر گھر میں اپنی

ہم نہ ہوئے وہاں!

یہ تو صرف ہم ہی جانتے ہیں کہ ہم اگر وہاں ہوتے تو کون سا تیر مار لیتے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اکثر و بیشتر بڑے طمطراق سے ہمیں یہ جملہ ادا کرنا پڑتا ہے کہ ہم نہ ہوئے وہاں!

جسمانی طور پر تو شاید ہم نہیں [illegible] یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ہمیں نہیں دیکھا اور اگر آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ نے ہمیں دیکھا ہے تو آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ ہمارے بجائے کوئی اور ذات شریف ہوں گے کیونکہ جس چیز کو جسم کہتے ہیں اور جس میں ہڈیوں کے علاوہ گوشت پوست کی بھی ایک معقول مقدار ہوتی ہے، وہ ہمارے حصے میں نہیں آیا۔ البتہ پھونک مارنے سے ہوا میں معلق ہو جانے والے ہڈیوں کے کسی ڈھیر کو اگر آپ نے دیکھا ہے تو کچھ یقین کیا جا سکتا ہے کہ شاید آپ نے ہمیں دیکھا ہو۔ ان جسمانی خصوصیات کی روشنی میں ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ پچھلے دنوں جب دلّی میں دنگل ہو رہے تھے اور ہمارے ایک عزیز کہ ہڈی جن کی کافی مضبوط تھی اور جنہیں باہر کے دنگل دیکھنے اور گھر

میں ملاقات کی ہوتی اور وہاں یہی جملہ ادا کیا ہوتا تو سوچئے آپ کے جگری دوست کی نظر میں یا آپ کی بیوی کے پورے خاندان کی نظر میں آپ کی عزت کتنی بڑھ جاتی!

عزت بڑھانے کے اس نادر نسخے کی جیسا کہ کہا گیا ہے کچھ حدیں بھی ہیں۔ بات بات پر "ہم نہ ہوئے وہاں" کہنا اتنا مضر بھی ہو سکتا ہے جتنا کہ موقع محل دیکھ کر کہنے سے مفید بلکہ بعض اوقات تو صرف ایک جملہ اس کے ساتھ اور جوڑ کر یعنی "ہم نہ ہوئے وہاں" کے بجائے "اچھا ہی ہوا کہ ہم نہ ہوئے وہاں" کہہ کر اپنا الّو سیدھا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آپ کو معلوم ہے کہ پارسال اپنی بیوی کے لئے جو جھمکے آپ خرید کر لائے تھے اُن میں نصف سے زیادہ کھوٹ تھا۔ قیمت اُن کی آپ نے چالیس روپے ادا کی تھی لیکن بیوی کو نوّے روپے بتائی تھی۔ اب اگر آپ کی بیوی چند صرافوں کو دکھانے کے بعد وہ جھمکے چوبیس روپے ساڑھے پیسے میں بیچ آتی ہے اور جیسا کہ ہونا چاہئے آپ کی نیّت پر شک کر رہی ہے تو اس وقت زور شور سے "ہم نہ ہوئے وہاں" کہہ کر آپ ایک مستقل عذاب مول لے سکتے ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ صراف کے یہاں جانے سے آپ کا انکار سن کر آپ کی بیوی آپ کی دیانتداری کا مژدہ سُنانے اپنے میکے چلی جائے۔ اس صورت میں آپ کی عزت صرف اس طرح بچ سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے کہ آپ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ یہ اعلان کر دیں کہ "اچھا ہی ہوا ہم نہ ہوئے وہاں" اور اس کی تشریح آپ یہ کریں کہ اگر آپ وہاں ہوتے تو اس وقت گھر کے بجائے یا تو جیل میں ہوتے یا ہسپتال میں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی بیوی جیل یا ہسپتال کے بجائے آپ کو گھر پر دیکھنا زیادہ پسند کرے گی۔ اور نہ صرف آپ کی جوانمردی کی قائل ہو جائے گی بلکہ آپ

بیوی کے ساتھ بیٹھے ریڈیو پر مشاعرہ سنتے ہوئے آپ بڑی بے چینی سے پہلو بدل بدل کر اور ہر شعر پہ ناک بھوں چڑھا کر اور اظہار افسوس کے طور پہ "ہم نہ ہوئے وہاں" کی رٹ لگا کے اپنا رشتہ شیکسپیر، ملٹن اور شیخ سعدی سے ملا سکتے ہیں۔ اور گھر میں رامائن یا قرآن شریف پڑھنے والی بیوی سے منوا بھی سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ ذرا سی احتیاط کے ساتھ یہ جملہ ادا کر کے آپ ہر شخص پہ اپنے ہر فن مولا ہونے کا رعب جما سکتے ہیں۔ احتیاط کی ضرورت اس میں صرف اتنی ہے کہ بس از وقت ادا کیا جانے والا یہ جملہ قبل از وقت ادا نہ ہو۔ مثال کے طور پہ آپ کے کوئی جگری دوست یا آپ کی بیوی کے کوئی قریبی رشتہ دار جیب تراشی کے جرم میں گرفتار ہو کر کوتوالی میں بند ہیں۔ آپ ان سے ملنے کوتوالی میں جاتے ہیں اور جیسا کہ آپ کی عادت ہے پولیس کے معمولی سپاہی سے لے کر علاقہ مجسٹریٹ تک سے اپنے غیر معمولی مراسم کا ذکر کرنے کے بعد بالکل بے خیالی میں آپ کے منھ سے یہ جملہ نکل جاتا ہے کہ "ہم نہ ہوئے وہاں" اور تشریح آپ اس کی یہ کرتے ہیں کہ افسوس آپ موقع واردات پر نہ ہوئے۔

تشریح آپ جو بھی کریں یہ جملہ ادا کرتے ہوئے آپ نے یہ نہ سوچا کہ اس وقت آپ قریب قریب ویسی ہی جگہ پر موجود ہیں کہ جس جگہ پر موجود نہ ہونے کا آپ کو افسوس تھا بلکہ اس سے زیادہ موزوں جگہ پر موجود ہیں ——

اب جائیے کوتوال صاحب کے گلے میں بازو ڈال کر اس پیشہ ور جیب تراش کی ضمانت کرائیے اور دوسرے دن عدالت میں اپنے اور علاقہ مجسٹریٹ کے ہم نوالہ ہم پیالہ ہونے کا ثبوت بہم پہنچائیے۔ اس کے برعکس اگر آپ نے ذرا سی احتیاط سے کام لیا ہوتا یعنی کوتوالی میں ملنے کے بجائے سزا ہو جانے کے بعد مجرم سے جیل

آئی ہے کہ جس سے متاثر ہو کر یک نہ شد چار شد، خدمت گار دنیا کے تمام کام دھندے چھوڑ کر ہماری خدمت پر مامور بلکہ کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وقت مذاق کا نہیں ہے کیونکہ ہمارے چھوٹے بھائی صاحب نہ صرف ہمارا نام لے کر محلہ چاقو ماران کے ایک نوجوان کو پیٹ آئے ہیں بلکہ ہمارے وسیع تعلقات کا اعلان کر کے بہ بانگِ دہل یہ بھی فرما آئے ہیں کہ یوں چٹکی بجا کر ہم پورے محلے کو بندھوا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے وقت چاہے مذاق کا ہو یا تشویش کا، اپنا نام سن کر اور یہ سن کر کہ ہمارا شہرہ دُور دُور پھیل رہا ہے، کون کور ذوق ہو گا کہ فخر سے جس کی گردن نہ تن جائے۔ پھر معاملہ چونکہ چھوٹے بھائی صاحب کا تھا اس لئے نہ صرف فخر سے ہماری گردن تن گئی بلکہ اور بھی فخر سے ہمارے مُنھ سے نکل گیا ــــ "ہم نہ ہوئے وہاں ورنہ۔۔۔"

لفظ 'ورنہ' یوں ہی الل ٹپ نہیں خوب سوچ سمجھ کر ہم نے اس جملے سے لگایا تھا۔ نہ لگاتے تو جیسا کہ کہا جا چکا ہے نہ صرف اس جملے کی بدولت کمائی ہوئی ہماری تمام عزّت اور شہرت پر پانی پھر جاتا، بلکہ فخر سے تنی ہوئی ہماری گردن پھر کبھی بغیر فخر کے بھی نہ تن پاتی۔

"ورنہ" چاروں چاقو ماروں نے ہمارے اس لفظ کو دبوچ لیا۔ "ورنہ آپ کیا کر لیتے؟"

"ورنہ ہم سمجھوتہ کرا دیتے!" بڑی حلیمی سے ہم نے جواب دیا ــــ

ــــ "آخر لڑائی بھڑائی میں کیا رکھا ہے!" وہ دن اور آج کا دن، وہ چاروں چاقو مار جب بھی راستے میں ملتے ہیں، بڑے ادب سے اور سرِ تسلیم خم کر کے ملتے ہیں۔

ایسا فراخدل شوہر پا کر، جو روپے پیسے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرے گی۔

'اچھا ہی ہوا ہم نہ ہوئے وہاں' کے علاوہ بعض اوقات 'ہم نہ ہوئے وہاں ورنہ....' کہنے سے بھی اس نادر نسخے کو تیر بہدف کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

خود ہمارے ساتھ ایک بار ایسا واقعہ پیش آیا کہ اگر اس وقت ذرا سی سوجھ بوجھ سے کام لے کر ہم اس جملے کے ساتھ 'ورنہ' نہ لگاتے تو نہ صرف اس جملے کی بدولت کمائی ہوئی تمام عزت اور شہرت گنوا بیٹھتے، بلکہ اس وقت یہ مضمون قلمبند کرنے کے بجائے خدا کو اپنے گناہوں کا حساب دے کر جہنم واصل ہو چکے ہوتے۔ ہوا یہ کہ ایک دن بالکل ناگہانی طور پہ چار عدد چاقو مار قسم کے انسان کہ صورت سے بھی اور سیرت سے بھی — ملک الموت معلوم ہوتے تھے خم ٹھونکتے ہوئے ہمارے یہاں نازل ہوئے اور آتے ہی للکارا۔

" آپ ہی کا نام پرکاش پنڈت ہے نا؟"

"جی ہاں" ہم نے جواب دیا "فرمائیے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

"خدمت" طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے اور کنپٹیوں تک پہنچی ہوئی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ایک چاقو مار نے کہا "خدمت تو ہم کریں گے آپ کی"۔

صاف ظاہر تھا کہ خدمت سے ان کی مراد ہماری مرمت تھی۔ تا ہم جی کڑا کر کے ہم نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ آخر انھیں ہم میں ایسی کونسی خوبی نظر

تمام سفارشی خطوط لکھتے وقت بھی میں نے کبھی ماتھے پر بل نہیں ڈالا۔ دن دن بھر کچہریوں کی خاک چھان کر ان لوگوں کی ضمانتیں کرائیں جو ضمانت ہوتے ہی فرار ہو گئے۔ اور مشتبہ چال چلن کے لوگوں سے بیچ چوراہے میں گلے ملا تاکہ خفیہ پولیس ان کا تعاقب چھوڑ دے اور میرا تعاقب شروع کر دے۔ لیکن افسوس کہ اپنی تمام تر نیک خواہشات کے باوجود پہچاننے کا یہ سلسلہ مجھے منقطع کرنا پڑا۔

پہچاننے کا یہ سلسلہ منقطع کرنے کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ پہلے کے مقابلے میں میری بینائی کمزور ہو گئی ہے یا میری قوتِ حافظہ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ لوگوں کو قرض دے کر فراموش نہ کر سکوں میں اب بھی آپ کے انتہائی کند ذہن نورِ چشم کو اول درجے میں پاس کروا سکتا ہوں اور اسے ملازمت بھی دلوا سکتا ہوں۔ میری وساطت سے آپ کا اوٹ پٹانگ مضمون ملک کے سب سے معیاری اخبار میں شائع ہو سکتا ہے اور بڑے بڑے جغادری نقاد اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا سکتے ہیں۔ لیکن افسوس آئندہ میرے وجود سے آپ کو اس قسم کا کوئی فیض نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ اب اگر آپ سلام کر کے مجھ سے کہیں گے کہ "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" تو نہ صرف اس وقت بلکہ حشر تک میں آپ کو پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔

میرے اس انکار کی وجہ خدانخواستہ یہ بھی نہیں ہے کہ مجھے آپ سے کسی طرح کی کد ہے۔ بلکہ میری تو آپ سے بھی مخلصانہ درخواست ہے کہ میرے نقشِ قدم پر چلیے اور ہر ایرے غیرے بلکہ نتھو خیرے تک کو پہچاننے سے انکار کر دیجیے۔ انکار نہیں کر سکتے تو اقرار کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح موقع محل دیکھ لیجیے۔ ورنہ ایک دن آپ کا بھی وہی حشر ہو گا جو ان

آپ نے مجھے پہچانا نہیں

راستہ چلتے چلتے اچانک کوئی بچہ بوڑھا یا جوان آپ کو سلام کر کے کھڑا ہو جاتا ہے اور آپ کو حیران و پریشان دیکھ کر کہتا ہے۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

اور آپ یا تو فوراً اسے پہچان لیتے ہیں۔ یا پہچاننے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ اور اخلاق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اگر انسان خود کو نہ پہچان سکے تو کم از کم دوسروں کو پہچاننے سے انکار نہ کرے۔

ایک عرصے تک خود میرا یہ حال تھا کہ جوں ہی کسی نے مجھ سے یہ جملہ کہا کہ "آپ نے مجھے پہچانا نہیں" تو نہ صرف دل ہی دل میں اپنی قوتِ حافظہ کا ماتم کرنے لگتا تھا بلکہ ایک طرح کے احساسِ برتری سے میری چھاتی تن جاتی تھی اور آؤ تاؤ دیکھے بغیر میں فوراً اس شخص کو پہچان لیتا تھا۔

پہچاننے کا یہ اخلاقی سلسلہ آئندہ بھی جاری رہتا۔ اگر اس کی قیمت مجھے صرف اپنے برساتی کوٹ یا چھڑی چھاتے وغیرہ کی صورت میں ادا کرنی پڑتی لوگوں کو پہچاننے کے بعد اُن کی خاطر وزیرِ صحت اور انکم ٹیکس آفیسر کے

بے تکلفی

دو لکھنوی بزرگوں کا "پہلے آپ" والا قصہ یا لطیفہ آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ اور اس لکھنوی تکلف پر آپ مسکرائے یا ہنسے بھی ہوں گے کہ واہ تکلف تکلف میں ہی ان بزرگوں کی گاڑی چھوٹ گئی اور وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ایک دوسرے سے "پہلے آپ" "اجی نہیں قبلہ پہلے آپ" کی رٹ لگاتے رہے۔ اور غالباً اسی قسم کے کسی واقعہ سے متاثر ہو کر استاد ذوق نے بھی فرمایا تھا کہ: ۔ ع

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

تکلف میں ممکن ہے ان لکھنوی بزرگوں کے علاوہ استاد ذوق اور استاد ذوق کے علاوہ خود آپ کو بھی کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ مثلاً کسی سرکاری افسر سے آپ کی جان پہچان تو ہے مگر بے تکلفی نہیں اور تکلف کی وجہ سے آپ اپنے میٹرک فیل سالے کی سفارش اس سے نہیں کر سکتے یا پھر آپ کو روپے کی ضرورت ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے پڑوس میں جو بنیا رہتا ہے، وہ سود پر قرض دے سکتا ہے مگر اس سے چونکہ آپ کی بے تکلفی نہیں اس لئے آپ اس سے قرض نہیں مانگ سکتے یا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے کسی دوسرے یا

دنوں خاکسار کا ہو رہا ہے۔

ہوا یہ کہ پچھلے دنوں رات کے نہ جانے کتنے بجے ایک بزرگ میرے یہاں تشریف لائے اور ایسا شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور ایسے پُرحسرت لہجے میں "آپ نے مجھے پہچانا نہیں" کہا کہ حسب عادت آؤ تاؤ دیکھے بغیر میں نے انھیں پہچان لیا۔

میں پیدا تو ضرور اپنے آبائی گاؤں میں ہوا ہوں۔ مگر اب اُس گاؤں سے میرا تعلق صرف اتنا ہے کہ وہ میرا آبائی گاؤں ہے۔ ورنہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے اپنے گاؤں کی شکل دیکھی ہے نہ اپنے آبا و اجداد کی لیکن اُن بزرگ کے اصرار پر جنھوں نے بار بار شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر پھیر کر ہمارے خاندان کے ساتھ اپنے خاندان کا شجرۂ نسب ملا دیا تھا میں نے اُنھیں تاؤ کہہ کر پکارا۔ تاؤ کہہ کر پکارنے کی دیر تھی کہ اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اور اس کے ساتھ وہ خود بھی چمک کر چارپائی پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ایک بار پھر شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پہ پھیر کر بولے "اُٹھو باہر گلی میں تمہاری تائی اور تمہارے بھائی بیٹھے ہیں۔ چل کر انھیں لے آؤ" گلی میں ایک عدد تائی اور پون درجن بھائی تین بھینسوں اُنیس ٹرنکوں اور چودہ چارپائیوں سمیت میرا انتظار کر رہے تھے۔

میرے وہ تاؤ اور تائی اور پون درجن بھائی اپنی تین بھینسوں اُنیس ٹرنکوں اور چودہ چارپائیوں سمیت پچھلے چھ ماہ سے میرے غریب خانے کی رونق بڑھا رہے ہیں اور ان کا ارادہ اس وقت تک رونق بڑھانے کا ہے جب تک اپنا غریب خانہ اُن کے حوالے کر کے اور خود غریب الوطن ہو کر میں اپنے آبائی گاؤں میں نہیں جا بستا۔

معصومیت کے ساتھ آپ سے کچھ اس قسم کا سوال کرے گا "کیوں بھائی رام اوتار یا اجاگر سنگھ یا رحمت اللہ کل شام کے چار بجے مال روڈ پر تمہارے ساتھ وہ خوبصورت سی عورت کون تھی ؟"

وہ خوبصورت سی عورت آپ کے ساتھ مال روڈ پہ تو کیا کبھی آپ کے فرشتوں کے ساتھ ساتویں آسمان پر بھی نہیں تھی، لیکن اب اس کا کیا علاج کہ آپ کے لاکھ رونے گانے پر بھی آپ کی بیوی کو آپ پر یقین نہیں آرہا اور بفرضِ محال اگر اس دن آگیا تو دوسرے دن جب آپ کے بے تکلّف دوست سے وہ یہ تفصیل سُنے گی کہ اس عورت نے جارجیٹ کی سفید ساڑھی اور نیلا بلاؤز پہن رکھا تھا اور تیسرے دن یہ کہ نہ صرف وہ آپ کے ساتھ مُسکرا مُسکرا کر باتیں کر رہی تھی بلکہ اپنی آنکھوں سے اس نے آپ دونوں کو ہاتھوں میں ہاتھ لئے ہوئے بھی دیکھا تو آپ کی بیوی کو تاحشر آپ پر یقین نہیں آسکتا۔ اور بے تکلّفی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کے بجائے آپ کی بیوی کو آپ کے دوستوں پر یقین آئے "تاکہ آپ کے یہاں آکر وہ بلا ناغہ آلوؤں کے پراٹھے، گاجر کا حلوہ اور چھ چھ انڈوں کا آملیٹ ڈکار سکیں۔

چلئے اس کو بھی چھوڑیئے کیونکہ ممکن ہے ابھی تک آپ کی شادی نہ ہوئی ہو اور اگر ہوئی ہو تو آپ کی بیوی ایسی جبر جنگ ٹائپ کی ہو کہ آپ کے دوست تو کیا خود آپ بھی بلا اجازت گھر میں نہ گھُس سکتے ہوں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بے تکلّف دوستوں کو بے تکلّفی جتانے کے لئے آپ کو بیچ چوراہے میں پکڑنا پڑے گا۔ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو سول سرجن کے ساتھ، وکیل ہیں تو انتہائی دولتمند موکّل کے ساتھ، پروفیسر ہیں تو کالج کے پرنسپل کے ساتھ اور ادیب ہیں تو کسی بہت بڑے رسالہ کے ایڈیٹر کے ساتھ بڑے عالمانہ اور فلسفیانہ

نزدیک کے رشتہ دار کے یہاں جائیں اور اتفاق سے اس وقت آپ کو بھوک بھی لگی ہے مگر تکلف میں آکر آپ رس گلوں اور سموسوں کو ہاتھ نہ لگائیں اور صرف ایک پیالہ چائے پر قناعت کر گزریں۔

انھیں تکلیفوں کی بنا پر خاکسار راقم الحروف بھی جسے سفارشیں کرنے اور روپیہ قرض لینے کی اکثر ضرورت پڑتی رہتی ہے ایک زمانے تک تکلف کو بہت بڑی لعنت اور بے تکلفی کو عین راحت سمجھتا رہا۔ آئندہ بھی سمجھتا اگر پچھلے دنوں ٹھنڈے دل سے اس نے تکلف کی تکلیفوں اور بے تکلفی کی راحتوں پر غور نہ کیا ہوتا۔ آپ بھی غور کیجیے کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور محنت مشقت کے بعد بڑے اطمینان کے ساتھ آپ اپنے نرم و گرم بستر میں ڈبکے میٹھی نیند سو رہے ہیں کہ ایکا ایک آپ کے لحاف میں جیسے سرکس کے ہاتھی گھوڑے گھس آتے ہیں اور دوسرے لمحے آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کمرے کے یخ بستہ فرش پر کھڑے پالے میں ٹھٹھر رہے ہیں اور آپ کے ایک بے تکلف دوست آپ کے لحاف میں گھسے بے تحاشہ قہقہے لگا رہے ہیں۔ آپ گئے وہ بے تکلف دوست اس وقت سینما کا آخری شو دیکھ کر گھر لوٹ رہے تھے کہ ناگاہ ان کے دل میں آپ کی محبت کی رگ پھڑک اٹھی اور آپ جانیں جب کسی بے تکلف دوست کی محبت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے تو چاہے وہ رات کو سینما کا آخری شو دیکھ کر لوٹ رہا ہو یا دن دہاڑے جیب تراشی کے جرم میں گرفتار ہو کر ضمانتی کی تلاش کر رہا ہو، سیدھا آپ کے یہاں پہنچے گا۔

چلیے اس کو چھوڑیے۔ ممکن ہے آپ کی دوستی کسی جیب تراش یا سینما کا آخری شو دیکھنے کے دلدادہ دوست سے نہ ہو لیکن آپ کی دوستی کسی ایسے دوست سے ضرور ہو گی جو وقتاً فوقتاً آپ کی بیوی کی موجودگی میں بڑی

سب ٹھیک ہو جائے گا

ہیر سیال نے اپنے نکاح کے موقع پر جب بوکھلا کر "ایں" کہا اور مولوی صاحب نے اسے "ہاں" قرار دیتے ہوئے فوراً نکاح پڑھا دیا تو ماتنا کی ماری ہیر کی ماں نے چھاتی کوٹ لی اور بلک بلک کر مولوی صاحب سے شکایت کی، کہ حضرت آپ نے یہ کیا قہر کر دیا؟ تو حضرت یعنی سفید ریش مولوی صاحب نے، جن کی ریش ظاہر ہے دھوپ میں سفید نہ ہوئی ہوگی، اپنی ریشِ مبارک پر دستِ مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا: "آپ فکر نہ کیجئے، سب ٹھیک ہو جائے گا" ——— اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ نکاح کے بعد نہ تو ہیر کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت رہی تھی نہ ہیر کی ماں کو۔ یہاں تک کہ خود رانجھے نے مطمئن اور بے فکر ہو کر کان چھدوا لئے تھے۔ بدن پر بھبھوت مل لی تھی اور گورو گورکھ ناتھ کا چیلا بن کر الکھ نرنجن کا نعرہ بلند کرنا شروع کر دیا تھا۔

"آپ فکر نہ کیجئے، سب ٹھیک ہو جائے گا" ——— قرنوں اور صدیوں سے چلا آ رہا یہ جملہ ایک دو بار نہیں۔ آپ نے سینکڑوں بار سنا ہوگا اور مجھے یقین ہے جتنی بار آپ نے یہ جملہ سنا ہوگا، اس سے کچھ زیادہ بار ہی سب ٹھیک

انداز میں گفتگو کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور آپ کا مخاطب آپ کے وسیع مطالعے، تجربے اور آپ کی بارعب شخصیت سے بے حد متاثر ہو رہا ہے کہ سڑک کی دوسری جانب سے اونچے سُروں میں ایک آواز آتی ہے ـــــ "کیوں بے چغد! ابے او ناہنجار! سُنتا کیوں نہیں۔ تیرا باپ کب سے کھڑا چلا رہا ہے۔" پلٹ کر آپ دیکھتے ہیں تو آپ کے باپ کے بجائے آپ کو اپنا ایک بے تکلف دوست نظر آتا ہے جو قریب آکر اور آپ کے مخاطب سے صرف اتنا کہہ کر کہ "معاف کیجئے گا ان سے ذرا میری بے تکلفی ہے" از سرِ نو ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے کہ آپ تو آپ، آپ کے مخاطب کو بھی بے ساختہ اس بے تکلفی کی داد دینا پڑتی ہے۔

تکلف کی تکلیفوں اور بے تکلفی کی راحتوں پر راقم الحروف کو غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اگر بے تکلفی کی راحتیں متذکرہ بالا راحتوں تک محدود رہتیں لیکن جب سے راقم الحروف کے ایک بے تکلف دوست نے سوتے میں قینچی سے راقم الحروف کی ایک مونچھ اور بڑی شفقت سے پالی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی کے آدھے حصّے کا صفایا کر کے کم از کم چھ ماہ تک اُسے گھر میں آرام کرنے کی راحت بہم پہنچائی ہے۔ راقم الحروف کا اُردو شاعری پر سے اور خاص طور سے استاد ذوق کی شاعری پر سے ایمان اُٹھ گیا ہے۔ سوتے جاگتے اس کے منہ سے بس ایک ہی صدا نکلتی ہے کہ "ہائے تکلف، ہائے تکلف" اور اگر اس کے کسی اور بے تکلف دوست نے باقیماندہ نصف داڑھی مونچھ کا صفایا نہ کر دیا تو منڈھی ہوئی نصف داڑھی مونچھ کے اُگ آنے پر اس کا ارادہ ہے کہ وہ پوری دنیا میں اس لکھنوی تکلف کو رائج کرنے کا بیڑہ اُٹھائے گا جس سے سراسر تکلیف کے بجائے صرف اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ ایک گاڑی چھوٹ جاتی ہے۔

سامنے رہتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحبان کے منہ سے یہ جملہ سُن کر ہمیشہ میری باچھیں کھل جاتی ہیں اور میں اُچھلتا کودتا گھر لوٹتا ہوں۔ برسوں سے جدّی جائیداد کا مقدمہ چل رہا ہے اور ہر پیشی پر جائیداد بڑی صفائی سے ہاتھ سے نکلتی نظر آتی ہے مگر واہ رے وکیل صاحب کہ یہ جملہ دُہرا کر مجھے غیر متعلقہ جائیداد پر بھی قبضہ دلا دیتے ہیں۔ پچھلے برس صاحبزادے نے بتایا کہ امتحان میں اُس کے پرچے اچھے نہیں ہوئے۔ ممتحن سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ تشویش کا اظہار کیا تو فرمانے لگے "آپ فکر نہ کیجیے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اور سچ مچ امتحان کا نتیجہ نکلنے کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ کیونکہ نتیجے کے دن سے صاحبزادے صاحب لاپتہ ہیں اور میں ان کی تعلیم و تربیت سے بالکل بے فکر ہو گیا ہوں۔

ذاتی واقعات یا واردات سے قطع نظر اس بات کو تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ واقعات اور واردات سے بھری اس دنیا میں اس اطمینان بخش جملے کے بغیر مفر نہیں اور آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ خود آپ نے نتائج سے قطع نظر کئی بار یہ جملہ دُہرایا ہوگا۔ کیسے نہیں دُہرائیں گے۔ جب آپ کا چچا زاد بھائی جیب تراشی کے جُرم میں گرفتار ہو کر اور ضمانت پر رہا ہو کر آپ سے مدد مانگنے آیا ہے۔ جب کہ آپ پورے خاندان پر اس بات کا رعب جمائے ہوئے ہیں کہ فلاں انسپکٹر آپ کا ہم نوالہ اور فلاں سپرنٹنڈنٹ پولیس آپ کا ہم پیالہ ہے۔ یا آپ کیسے اِس جملے سے بچ سکیں گے جب آپ کے سُسر صاحب جنھوں نے آپ کی ہیڈ کلرکی سے مرعوب ہو کر اپنی سب گُن پوری لڑکی آپ کی نذر کر دی تھی، آپ کے سالے صاحب کے ساتھ آپ کے گھر تشریف لائیں گے اور عرصہ تین

ہو گیا ہو گا۔

ذاتی طور پر یہ جملہ میں نے سب سے پہلے چھ برس کی عمر میں سنا تھا۔ جب میرے والد بزرگوار نے میرے اسکول آکر میرے ماسٹر سے شکایت کی تھی کہ میں کسی کا کہنا نہیں مانتا۔ دن بھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہوں اور کبھی پڑھنے لکھنے پر توجہ نہیں دیتا ——— اور میرے ماسٹر صاحب نے کمالِ ہمدردی سے اُنھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا تھا، "آپ فکر نہ کیجئے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چنانچہ میرے والد تو مطمئن ہو کر گھر چلے گئے اور میرے ماسٹر صاحب نے بھری کلاس میں مجھے بنچ پر کھڑا کرکے بڑے مشفق تھپڑوں اور گھونسوں سے مجھے ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔

دوسری بار یہ جملہ میں نے اُس کے دوسرے دن پھر سُنا۔ جب میں نے اسکول جانے سے انکار کر دیا اور سڑکوں پر طلسمی انگوٹھیاں اور منتر پھونکے ہوئے گنڈے تعویز عطا کرنے والے ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی شاگردی اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور میرے شفیق ماموں نے مجھے اپنی تحویل میں لیتے ہوئے میری والدہ سے کہا۔ "آپ فکر نہ کیجئے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اور انھوں نے میری ٹانگوں میں لکڑی کا اڑنگا دے کر اور مجھے مرغا بنا کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم اپنے نیک ارادے سے باز آؤ گے یا میں تمہیں ٹھیک کروں ؟

وہ دن اور آج کا دن اِس جملے نے زندگی کی راہ میں قدم قدم پر نہ صرف مجھے ٹھیک کیا ہے بلکہ بے فکری کی ایسی گراں بہا دولت بخشی ہے کہ خدا دے اور ناچیز بندہ لے۔

اپنے دل کے مرض کی وجہ سے ہر وقت جہنم کا نقشہ میری آنکھوں کے

بس !"

پانچ دن بعد جب مجرم یعنی سالے صاحب کو تین مہینے کی بامشقت سزا ہوگئی تو میں پھر دوڑا دوڑا چودھری صاحب کے پاس پہنچا۔ قصۂ غم بیان کیا تو بولے، "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیسے ہو جائے گا۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "اُسے تو بامشقت سزا ہو گئی ہے۔"

بڑے اطمینان سے بولے "میں جیلر سے کہہ دوں گا کہ اس سے زیادہ کڑی مشقت نہ لے ــــ بس !"



سال میں اُسے کلرکی تک نہ دلا سکنے کی آپ کو شرم اور غیرت دلائیں گے۔

——— غیرت کے اسی مقام پر پہنچ کر خود میں نے اپنے سالے صاحب کو اپنے دفتر میں چپراسی کی ملازمت دلا دی تھی اور اس وجہ سے سسرال میں میری عزت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ لیکن حیف کہ اسی جملے کی وجہ سے پانچ بچّوں کی ماں ہو جانے پر بھی میری بیوی مجھ سے طلاق لینے کے درپے ہے۔

ہوا یہ کہ ملازمت کے تیسرے ہی دن اپنی شاندار ملازمت کے زعم میں آکر سالے صاحب نے کرایہ دینے کے بجائے پہلے مالکِ مکان کے دانت کھٹّے کئے اور پھر بڑی چابک دستی سے دو عدد توڑ ڈالے۔

گرفتاری پر میں دوڑا دوڑا اپنے عزیز دوست چودھری ہرنام سنگھ کے پاس پہنچا جو کسی معاملے میں بھی اپنے دوستوں کو کبھی فکر نہیں کرنے دیتے تھے۔ قصہ بیان کیا تو بولے "آپ فکر نہ کیجئے، سب ٹھیک ہو جائیگا"

میں بے حد گھبرایا ہوا تھا اس لئے اپنی تسلّی کی خاطر پوچھ بیٹھا کہ کیسے ٹھیک ہو جائے گا؟

"میں علاقے کے تھانیدار سے کہہ دوں گا کہ کیس رجسٹر نہ کرے ۔ بس!"

دوسرے دن جب کیس رجسٹر ہو گیا تو میں پھر دوڑا دوڑا چودھری صاحب کے پاس پہنچا۔ صورتِ حال بیان کی تو بولے "آپ فکر نہ کیجئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن کیسے؟"

"میں علاقہ مجسٹریٹ سے کہہ دوں گا کہ مجرم کو بری کر دے ۔

دام واپس کرنے کی حلفیہ پیش کش کو بھی بڑی فراخ دلی سے ٹھکرا دیں گے۔ لیکن اشتہار بازی کے مندرجہ بالا طریقے شاید ناکافی تھے۔ یا ان کے استعمال سے جادو فوراً سر چڑھنے کی بجائے آہستہ آہستہ چڑھتا تھا اور اس وجہ سے بولتا بھی دیر میں تھا۔ اس لئے یا نہ جانے کس لئے انسان کو اشتہار بازی کا ایک اور طریقہ وضع کرنا پڑا — شور کرنے کا طریقہ! مچھلی مارکیٹ تو اپنے شور کی وجہ سے عالمگیر شہرت رکھتی ہی ہے۔ اور اس شور سے گھبرا یا بوکھلا کے آپ رو ہو کے بجائے جھینگا مچھلی اور جھینگا مچھلی کے بجائے کیکڑے خریدنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن کیا کبھی آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ آخر الہ آباد کے پیڑوں کا نعرہ لگانے اور کھوئے کے پیڑوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے کسی مسخرے سے آپ پیڑوں کے نام پر کچے یا سڑے گلے امرود کیوں خرید لیتے ہیں؟ یا پھر ہفتہ بھر سے طے شدہ کوئی سنجیدہ فلم دیکھنے کا آپ کا پروگرام کسی لغو و لچر سٹنٹ فلم دیکھنے پر کیوں ختم ہوتا ہے؟ آپ نے غور نہ کیا ہوگا۔ کیا ہوگا تو ضرور اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ یہ سب اشتہار بازی کے اسی شور کرنے کے طریقے کا کرشمہ ہے۔

نوبت امرود خریدنے یا 'جانباز لٹیرا' نامی مکا مار کہ فلم دیکھنے تک رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ کبھی نہ کبھی امرود خریدنے ہی پڑتے۔ کسی کے دھوکے میں آ کے نہ خریدتے تو خود کو دھوکا دے کر خریدتے۔ اور اس فلم سے اور کچھ نہیں تو آئندہ کے لئے عبرت تو حاصل ہوئی۔ لیکن اُن اشتہار بازوں کا کیا کیا جائے جن کا مقصد اشتہار بازی سے زیادہ آپ کے کانوں کے پردے پھاڑنا ہوتا ہے اور آپ گھر کے چاہے لکھنؤ سے بارہ بنکی چلے جائیں یا نئی دلی سے نوٹنکی، وہ ہر جگہ آپ کے پُرتپاک استقبال کو موجود رہتے ہیں۔

اسٹیشن سے نکلئے۔ سامنے قطار اندر قطار لگے کھڑے آپ کو بغیر پہنچے کی مدد

اشتہار بازی

اشتہار بازی کے کئی طریقے ہیں۔ اخباروں میں اشتہار دینے کا طریقہ ہے۔ دیواروں پر پوسٹر، بسوں، ٹراموں اور ریل گاڑیوں میں تختیاں لگانے کا طریقہ ہے۔ ہینڈبل تقسیم کرنے، دکانوں کی پیشانی پر جہازی جسامت کے بورڈ لٹکانے اور سینما گھروں میں ایک دو ریل کے فلم دکھانے کا بھی طریقہ ہے۔ اور یہ طریقے انسان کو اس لئے وضع کرنا پڑے، کہ فی زمانہ انسانی زندگی ہوا، پانی، آگ وغیرہ عناصر ترکیبی سے زیادہ اشتہار کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔

بغیر اشتہار کے جوتے یا چھاتے کی پختگی کا یقین آتا ہے، نہ ہونے والی بیوی کے نیک خصلت ہونے کا۔ چوہے بھگانے کی گولیاں کتنی ہی سستی اور زود اثر کیوں نہ ہوں جب تک اشتہار میں ہم چوہوں کو ایک ساتھ گولیاں اور بٹخدیاں کھاتے نہیں دیکھ لیتے، ہمیں ان کے تیر بہدف ہونے کا اعتبار نہیں آتا۔ بال اگانے کی دوا کے استعمال سے چاہے آپ کے بچے کھچے دو چار بال بھی جھڑ جائیں۔ اگر دوا فروش نے دوا کا کما حقہ، اشتہار کر رکھا ہے تو دوا کو نہیں آپ اپنی بنجر کھوپڑی ہی کو الزام دیں گے۔ اور فائدہ نہ ہونے کی صورت میں

مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن ابھی چند ہی قدم اُٹھائے تھے کہ اوسان پھر خطا ہو گئے۔ الٰہی خیر! یہ بادل گرجا ہے، بجلی کڑکی ہے یا بم پھٹا ہے؟ ہڑبڑا کے آپ گرتے گرتے بچتے ہیں اور بہت ہی سراسیمہ نظروں سے اُس بلائے ناگہانی کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ جو ابھی ابھی ہوا کی سی تیزی سے آپ کے قریب سے نکلی تھی۔

اوہ! یہ تو موٹر تھی چلتا پھرتا اشتہار۔ اور وہ بم نہیں پھٹا تھا موٹر میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر نے آپ کے کان میں چیخ ماری تھی صابن! — سوفیصدی صابن!!

اسٹیشن سے گھر یا گھر سے اسٹیشن تک ہی کا نہیں؛ آج کل کوئی سا فاصلہ طے کرنا پل صراط عبور کرنے سے کم دشوار نہیں آپ اپنی ٹانگوں کو صحیح وسالم گھر لے جا سکتے ہیں۔ ہاتھ، منہ، آنکھ، ناک، ہر چیز جُوں کی تُوں گھر لوٹ سکتی ہے۔ لیکن کانوں کو صرف کوئی بہرہ شخص ہی بحفاظت گھر لے جا سکتا ہے۔ بیڑی یا صابن کا اشتہار کرنے والے نہ ملیں گے تو مداری اور مجمع باز ملیں گے۔ وہ نہ ملیں گے تو اپنی حالتِ زار کی تشہیر کرنے والے بھکاری ملیں گے۔ اور یہ سب نہ ملیں گے تو شادی کا اشتہار کرنے والے تو ضرور ہی مل جائیں گے۔

شادی کا اشتہار کرنے والے یعنی دولہا دلہن کے عزیز و اقارب میرے نزدیک سب سے کامیاب اشتہار باز ہیں۔ جو اپنے کھرے کھوٹے مال سے قطع نظر! ہر نو باہر آپ کو اپنے گھر میں بھی چین نہیں لینے دیتے۔ ادھر آپ کو چین آنا ہے اُدھر پڑوس میں مائیکروفون اور فلمی ریکارڈوں کے ذریعے شادی کے یہ پُر مسرت نعرے آپ کے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں ؎

میرے لئے جہان میں چین ہے نہ قرار ہے

یا ؎ آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا

یا پھر آوارہ ہوں — اوں ہوں — آوارہ ہوں

کے صاف نظر آرہے ہیں - اور آپ یکّے کے سفر کے لاتعداد فائدوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ لیکن اپنے عربی گھوڑوں اور افلاطونی یکوں کا اشتہار کرنے والوں کو آپ کی بینائی پر اعتبار ہے نہ فہم و فراست پر۔ اور آپ کے شاہ خرچ ہونے پر تو انھیں قطعی اعتبار نہیں۔ چنانچہ آپ کو جسمانی طور پر شکنجے میں کس کے وہ اس وقت تک اپنی بھانت بھانت کی بولیاں آپ کے کانوں میں انڈیلتے رہیں گے جب تک ہونے والے حشر کو بھول کر آپ کسی یکے پر سوار نہیں ہو جاتے۔ یا جوانی میں ورزش کے ذریعے کمایا ہوا آپ کا جسم آپ کے آڑے نہیں آجاتا۔ اور آپ صرف اپنے کپڑے پھڑوا کے اُن کی فولادی گرفت سے نکل بھاگنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔

آگے چلئے، لیکن نہیں، ابھی آگے مت چلئے۔ آگے راستہ بند ہے۔ راستہ کسی مذہبی، تہذیبی یا ماتمی جلوس کی وجہ سے بند نہیں۔ کسی ملکی یا غیر ملکی سیاسی شہسوار کی سواری بھی اِدھر سے نہیں گزر رہی۔ تو پھر راستہ کیوں بند ہے؟ یہ سوال آپ کے ذہن میں پیدا بعد میں ہوتا ہے، نا بیدر پہلے ہو جاتا ہے، کیونکہ آپ کے دیدۂ عبرت نگاہ کے سامنے انسانوں کا ایک گروہ جو انسانوں کے بجائے اپنی وضع قطع کے اعتبار سے لکڑ بھگوں کا گروہ معلوم ہوتا ہے، جسم کے ہر حصّے پر گھنگھرو باندھے نہ صرف وحشیانہ ناچ ناچ رہا ہے، بلکہ آپ کے گوشِ نصیحت نیوش میں چیخوں کے ذریعہ یہ مژدۂ جانفزا بھی پھونک رہا ہے کہ فلاں نمبر کی بیڑی کے دھوئیں میں الف ممدودہ سے بڑی ے تک کے تمام وٹامن موجود ہیں۔ اِس لیے اصلی گھی دودھ کے بدلے فلاں نمبر کی بیڑی خود بھی پیجیے اور اپنے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پاتوں کو بھی پلائیے۔

خدا خدا کر کے راستہ صاف ہوا۔ منتشر اوسان بجا کر کے آپ پھر منزل

صاف کہہ دیا کہ شادی سے تو ہم صاف انکار نہیں کرتے البتہ ایسی لڑکی سے شادی کرنے سے ضرور صاف انکار کرتے ہیں جو ہماری من پسند نہ ہو اور جس کا انتخاب ہم خود نہ کریں۔

من پسند لڑکی کا انتخاب، ہمیں معلوم تھا کہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے اس سہانی صبح کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جب ہمیں کسی لڑکی کی یا کسی لڑکی کو ہماری نہیں بلکہ دونوں کو دونوں کی کوئی ادا بھا جائے اور چونکہ اس سہانی صبح کا انتظار کئے بغیر دو تین بار اپنی اداکاری کے جوہر دکھا کر ہم کافی خمیازہ بھگت چکے تھے اس لئے ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے دوست رگھبر دیال کے نقش قدم پر چل کر شادی کے لئے ضرورت ہے کے اشتہاروں کے ذریعے اپنی من پسند لڑکی تلاش کریں۔

رگھبر دیال آج سے چھ سال پہلے ہمارے ساتھ بی۔اے میں پڑھتے تھے اور اب بھی بی۔اے میں ہی پڑھتے ہیں۔ لیکن ان اشتہاروں کی بدولت ایک ایم۔اے پاس بیوی کے شوہر بن چکے ہیں جو کسی کالج میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ خود انھیں بھی پڑھاتی ہے۔

اسی طرح کی ایک اور مثال ہمارے دوست دل جیت سنگھ کی تھی جنھیں کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اُن کے والد نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جائداد سے بے دخل کر دیا تھا لیکن اب وہ ایک ایسے سسر کا داماد ہونے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں، جن کا چمڑے کی رنگائی کا کاروبار دلّی اور کانپور کے علاوہ سڈنی اور فلسطین تک پھیلا ہوا ہے۔

اِن جیتی جاگتی مثالوں کے پیشِ نظر یہ نسخہ کافی آسان اور کارآمد نظر آیا اور ہمیں ہینگ پھٹکری کے بغیر چوکھے رنگ کی توقع ہو گئی اور اسے

ضرورت ہے

ملازمت کے لئے 'ضرورت ہے' کے اشتہار دیکھنے کی جب ضرورت نہ رہی اور بقول ہمارے اور بقول ہمارے والدین اور بقول شخصے ہم برسر روزگار ہو گئے تو ضرورت پیش آئی کہ شادی کے لئے 'ضرورت ہے' کے اشتہاروں کا مطالعہ اسی باقاعدگی سے کیا جائے جس باقاعدگی سے ملازمت کے لئے 'ضرورت ہے' کے اشتہاروں کا کیا جاتا تھا۔

ہمارے والدین ہماری شادی پر مُصر تھے اور ہمارے والدین کے علاوہ ان لڑکیوں کے والدین تو اور بھی ہماری شادی پر مصر تھے جن کی لڑکیاں بقول اُن کے ہندوستانی بیویاں بننے میں یدِ طولےٰ رکھتی تھیں۔ یعنی سینے پرونے میں، کھانے پکانے اور موقع بے موقع رونے گانے میں اپنی مثال آپ تھیں۔ لیکن ہمیں گوارا نہ ہوا کہ اتفاق سے اس بیسویں صدی میں پیدا ہو جانے پر بھی ہماری شادی کا فیصلہ ہمارے بجائے ہمارے والدین کریں۔ اور اپنے ہم عصر والدین سے سازش کر کے مندرجہ بالا قسم کی کوئی سب گُن پوری لڑکی ہمارے پلّو سے باندھ کر خود مطمئن ہو جائیں اور ہمیں ہمیشہ کے لئے غیر مطمئن کر دیں۔ لہٰذا ہم نے صاف

بچوں کو صفر کے برابر تھیں۔ اس لئے ہم نے وہاں سے چپ چاپ سٹک آنے میں ہی مصلحت سمجھی اور دوبارہ اس وقت تک درخواست نہ دی جب تک چار عدد مستند ڈکشنریوں اور تین عدد پیشہ ور وکیلوں سے من پسند اشتہار کے ایک ایک لفظ کی تشریح نہ کرا لی۔ سابقہ تجربے کے علاوہ تشریح کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کیونکہ اشتہار کی عبارت بہت مختصر اور شرائط بہت آسان تھیں۔ صرف یہ الفاظ درج تھے:۔

"ضرورت ہے ایک سولہ سالہ برہمن دوشیزہ کے لیے ایک پچیس سالہ خوبصورت، صحت مند اور برسرروزگار برہمن نوجوان کی۔ قد جس کا ساڑھے پانچ فٹ سے کم اور وزن ڈیڑھ من سے زیادہ نہ ہو۔ پتلون پر دھوتی کو اور چائے پر فالسے کے شربت کو ترجیح دے۔ صبح جلدی اُٹھنے اور رات کو دیر سے سونے کا عادی ہو۔ جہیز مانگنے کی صورت میں اسے فوراً گرفتار کروایا جا سکتا ہے۔"

درخواست دے دی گئی۔ انٹرویو کے لئے بھی بلا لئے گئے۔ لیکن مسلسل دس دن تک فالسے کا شربت پینے، دھوتی پہننے، صبح جلدی اُٹھنے اور رات کو دیر سے سونے اور اس وجہ سے اپنی صحت کا ستیاناس کر لینے کے باوجود اس بار بھی ہمیں بے نیلِ مرام یعنی انٹرویو دیئے بغیر لوٹنا پڑا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی منظر نظر نواز ہوا جو پہلے انٹرویو کے سلسلے میں ہمارے لئے عبرت ناک ثابت ہو چکا تھا۔ بلکہ یہاں کے امیدواروں کی تعداد اور اُن کی عمر وہاں کے امیدواروں سے بھی زیادہ تھی۔ شاید اس لئے کہ اس لڑکی کی عمر پہلی لڑکی کی عمر سے ایک سال کم تھی۔

اتفاق کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ پہلی لڑکی یعنی پہلا اشتہار جو ہمیں پسند آیا، اس کے لئے درخواست دیتے ہی ہمیں انٹرویو کے لئے بلا لیا گیا۔

انٹرویو چاہے ملازمت کے سلسلے میں ہو چاہے شادی کے سلسلے میں ایک چیز دونوں میں مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ انٹرویو ہوتا ہے۔ لیکن ملازمت کے انٹرویو میں اور شادی کے انٹرویو میں سب کی سب باتیں مشترک ہوتی ہیں۔ اس کا نہ ہمیں علم تھا نہ اس کے لئے ہم تیار تھے۔ چنانچہ مقررہ جگہ پر پہنچ کر جب ہم نے اپنے علاوہ دو ڈھائی درجن امیدواروں کو اور وہ بھی بزرگ قسم کے امیدواروں کو محمود و ایاز کی طرح ایک صف میں کھڑے دیکھا تو ہمارے چھکے چھوٹ گئے۔ یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ لڑکی کی عمر اشتہار میں سترہ برس درج ہے اور یہاں سوائے ہمارے، ستاون برس سے کم عمر کا کوئی امیدوار نہیں۔ ہمّت کر کے ہم نے ایک سفید ریش امیدوار سے جو صف میں ہمارے آگے تھے بڑے ادب سے پوچھا:

"بزرگوار! آپ بھی شادی کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟"

"ہونہہ" بزرگوار نے ہنکارا اور بڑے غصے بھرے انداز سے کاغذوں کا ایک پلندہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔

کاغذوں کے اس پلندے میں تین کارخانوں، نو کوٹھیوں اور بائیس دوکانوں کی رجسٹریاں تھیں۔ مطالعے کے بعد وہ پلندہ ابھی ہم نے انھیں لوٹایا ہی تھا کہ ایک اور سفید ریش امیدوار نے جو صف میں ہمارے پیچھے تھے کاغذوں کا ایک اور پلندہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا اور بڑے شفقت بھرے انداز میں سرگوشی کی "برخوردار ہماری کوالی فکیشنز ان سے کم تو نہیں ہیں؟"

کوالی فکیشنز ان دونوں کی قریب قریب برابر تھیں لیکن ہماری کوالی فکیشنز

ہماری کیا حالت ہوئی قلم اس کے بیان سے بھی قاصر ہے۔ کیونکہ اس پری کا
کے چہرے پر ایک فٹ لمبی داڑھی، آنکھوں پر ٹوٹی ہوئی کمانی کا چشمہ،
ٹانگوں میں رعشہ اور ہاتھ میں لکڑی تھی۔ غش کھانے سے پہلے ملازم سے معلوم
ہوا کہ باہر لڑکیاں نہیں اسی قماش کی داڑھیاں اور لکڑیاں آئی ہیں۔ اگر ہم چاہیں
تو انھیں میں سے کسی داڑھی یا لکڑی کی سب گن پوری لڑکی کو پسند کریں یا اپنے
والدین کے آگے سپر ڈال دیں۔

ہوش آنے کے بعد ہم نے اپنے والدین کے آگے سپر ڈال دی کیونکہ
ہماری بے ہوشی کے دوران ... ہمارے والد صاحب ان والدِ ماجد سے
انٹرویو کر چکے تھے۔



کئی دن اسی اُدھیڑ بُن میں گزر گئے کہ آخر ـــــ جہاں دیکھتا ہوں وہاں تو
ہی تو ہے کے مصداق ہر جگہ بزرگ اُمیدواروں کی موجودگی چہ معنی دارد
نوجوانوں کے حصّے کا مال ہڑپ کرنے کے بجائے یہ مہا پرش کسی ودھوا آشرم
یا شمشان بھومی کا رُخ کیوں نہیں کرتے۔ لیکن کسی طرح یہ مسئلہ حل نہ ہوا۔ یہ
مسئلہ رگھبر دیال اور دیجیت سنگھ سے بھی حل نہ ہوا۔ جو اس قسم کے اشتہار
سے کافی سے زیادہ مستفید ہو چکے تھے۔ البتہ اس مسئلے کا ایک توڑ انھوں
نے ضرور سمجھایا۔ توڑ یہ تھا کہ خود درخواستیں دینے کے بجائے درخواستیں
طلب کی جائیں۔ طویل گفتگو کے ذریعے انھوں نے اس بات کا بھی یقین د
دیا کہ اگرچہ ان کی شادیاں ہو چکی ہیں پھر بھی شادی کی خواہشمند لڑکیوں
کی تعداد میں قطعی کمی نہیں آئی۔ پھر اشتہار مرتب کرنے میں بھی انھوں نے
ہماری مدد کی اور ہماری کامیابی پر پیشگی مبارکباد بھی دے ڈالی۔ معلوم ہو
تھا۔ بعد میں موصول شدہ درخواستوں کی تعداد سے معلوم بھی ہو گیا کہ اس
بار ہماری کامیابی سو فی صدی یقینی ہے۔ بلکہ بعض درخواستوں کے س
لڑکیوں کی جو تصویریں موصول ہوئی تھیں انھیں دیکھ کر تو خدا کی نذر ر
باز آتی تھی اور اپنا سا منہ لے کر رہ جانے کو جی چاہتا تھا۔ بارے انتظار
کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ انٹرویو کا دن اور پھر مقررہ وقت آ پہنچا اور جس
لڑکی کی تصویر ہمیں سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ اور جسے دل ہی
دل میں ہم نے بیوی کے روپ میں قبول کر لیا تھا، ملازم کے ذریعے ہم
نے اسے آواز دلوائی۔

آواز دلوانے اور اس پری چہرہ کے آنے تک ہماری کیا حالت
ہوئی قلم اس کے بیان سے قاصر ہے۔ لیکن اس پری چہرہ کے آنے کے بعد

یہ کایا کلپ کیوں اور کس طرح ہوا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ کایا کلپ داماد بننے سے پہلے ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن داماد بننے کے بعد آدمی کا جو کایا کلپ ہوتا ہے اُسے کچھ وہی خوش نصیب سمجھ سکتے ہیں جنھیں مجھ ایسی اُگتی عمر میں داماد بننے کی سعادت نصیب ہو چکی ہو۔

اس سے پہلے کہ میں بحیثیت داماد اپنی خوش بختیوں کا ذکر کروں، مجھے اقرار کی اجازت دیجئے کہ میرے بارے میں میرے والدین، میرے دوستوں، پڑوسیوں اور نوجوان لڑکیوں کی رائے کچھ زیادہ دُرست نہ تھی۔ میں ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا جسے کلرکی قسم کی ملازمت پسند نہ تھی۔ لیکن میرے والدین مجھے کلرک بنانے پر بضد تھے۔ میں اخبار نویس بننا چاہتا تھا۔ اس لئے میرے پڑوسی مجھے اخبارات کے دفتروں کے چکر کاٹتے دیکھ کر اس فیصلے پر پہنچ گئے کہ میں آوارہ گرد ہوں۔ دوستوں میں سے کوئی چنگی کا محرر ہو گیا تھا۔ کوئی انشورنس ایجنٹ اور کسی نے باپ کی آٹے دال کی منافع بخش دکان سنبھال لی تھی۔ اور مجھے محرری کی بالائی آمدنی، انشورنس کے فائدوں اور کالی چنوں کی گرتی ہوئی اور دارچینی کے تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں یہ میرے دوستوں کی عنایت ہی تھی کہ وہ مجھے صرف منہ پھٹ سمجھتے تھے۔ ورنہ ان نوجوان لڑکیوں کی طرح، جن کی طرف میں نے کبھی بھولے سے بھی نہ دیکھا تھا اور اس پاداش میں بے وقوف اور بدتمیز سمجھا گیا تھا۔ وہ میرے نام کے ساتھ اور بھی سنگین صفات جوڑ سکتے تھے۔ اور جہاں تک میری مندرجہ بالا صفات کا تعلق ہے، میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ وہ میرے سسرال والوں کا انکشافِ محض تھا۔ ورنہ میرے داماد بنتے ہی میری خوبیاں اُن کی مایوسیوں کا سبب نہ بنتیں۔

سب سے پہلی مایوسی جو میرے ساس سسر کو میری وجہ سے ہوئی، یہ

منکہ ایک داماد ہوں

وہ کوئی سُہانی صبح تھی یا سُہانی شام یہ تو یاد نہیں۔ البتہ آج سے
کچھ برس پہلے جب بی۔ اے کرنے کے بعد والدین کی نظریں میں نکھٹو
پڑوسیوں کی نظر میں آوارہ گرد دوستوں کی نظر میں مُنہ پھٹ اور نوجوان
لڑکیوں کی نظر میں بے وقوف اور بدتمیز تھا۔ اچانک یہ انکشاف ہوا کہ مجھ
میں مندرجہ ذیل قسم کی لاتعداد خوبیاں ہیں۔

"میں بڑا خوبصورت نوجوان ہوں۔"

"ایسا سعادت مند اور سلیقہ شعار ہوں کہ بڑوں کے سامنے آنکھ اُٹھا
کر بات نہیں کرتا۔"

"بات کرتا ہوں تو مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں"

اور ——

"قابلیت کا تو یہ عالم ہے کہ خود حکومت پریشان ہے کہ مجھے گورنر
کا عہدہ دے، مجسٹریٹ درجہ اول بنائے یا براہ راست اسمبلی میں لے
لے"

اُن ونوں انجام نہ دے سکتا تھا، اس لئے بڑی عاجزی سے میں نے اُس وقت تک انھیں اپنی لڑکی کو اپنے یہاں رکھنے کا مشورہ دیا جب تک میں کمائی ہو کر والدین کو دھتا نہیں بتاتا۔ اور ٹھوک، بال کی طرح اپنی چاروں بہنوں کے لئے چار عدد شوہر فراہم نہیں کر لیتا۔

یہ مشورہ میں نے اُن کی مایوسیوں میں قدرے کمی کرنے کو دیا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ ایسا دلپسند مشورہ پاتے ہی خوشی سے وہ میرا ماتھا چوم لیں گے۔ لیکن میرا ماتھا چومنے کی بجائے انھوں نے وہ ہو حق مچائی جیسے میں نے مشورے کے بجائے اُن کی سارا سُہاگن بیٹی کے ماتھے کا سیندور پونچھ دیا ہو۔

یہ اور اُن کی اس قسم کی دوسری مایوسیاں، میرا خیال تھا میرے کماؤ ہونے، میری بہنوں کے ٹھکانے لگنے اور والدین سے الگ گھر بسانے پر دور ہو جائیں گی۔ لیکن افسوس! میرا یہ خیال بھی محض خیال ثابت ہوا۔ اُن کی مایوسیوں میں اور بحیثیت داماد میری ناکامیوں میں بتدریج اضافے ہو رہے ہیں۔

ایک بزرگ (ایک ہی نہیں ایسے کئی بزرگ) سسر صاحب کا پروانہ لے کر آتے ہیں کہ تم انھیں نہیں جانتے۔ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ محکمۂ رسل و رسائل میں اِن کا جو کام اٹکا ہوا ہے۔ محکمۂ فلاح و بہبود کے سکریٹری یا وزیر سے مل کر اِن کا وہ کام کروا دو۔ اور اِن کی خوب خوب خاطر و مدارات کرو۔ اور میں اپنی سی کر گزرتا ہوں۔ اور سسر صاحب کے احکام کی حتی المقدور تعمیل کرتا ہوں لیکن میرے یہاں دو تین یا چار مہینے کے مختصر سے قیام کے بعد جب وہ بزرگ واپس جاتے ہیں تو میری بیوی کے نام میری ساس کا اندوہناک خط آتا ہے کہ:-

"ہائے! یہ حالت ہے تمہاری کہ ننھے بچوں کو تمہیں اپنے ہاتھ سے نہلانا

تھی کہ باقاعدہ داماد بن جانے پر بھی پھر سے پلیٹ فارم پر انھیں ڈنڈوت پر
کرنے کی بجائے میں نے صرف ہاتھ جوڑ کر نمستے کیوں کی ؟

دوسری مایوسی انھیں دوسرے دن ہوئی جب کہ میں نے نہ صرف چا
بجے صبح اُٹھنے سے معذوری چاہی بلکہ چودہ میل پیدل اور وہ بھی ننگے پاؤں چل
اُن کے کسی نامعلوم بزرگ کی سمادھی کی راکھ چاٹنے سے صاف انکار کر دیا۔
اور پہلے دبی زبان سے اور پھر کھُلی زبان سے انھیں یہ کہتے سُنا کہ اُن کی بیٹی ک
قسمت پھُوٹ گئی ہے۔ اُن کی نظر میں اُن کی بیٹی کی قسمت واقعی پھوٹ گ
تھی۔ کیونکہ تیسرے دن انھیں تیسری ناقابلِ برداشت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا
میرے سُسر، خدا اُن کے لئے ہمیشہ جنّت کے دروازے کھُلے رکھے۔ بڑی جانب
قسم کی مونچھوں کے مالک ہیں۔ اور اپنی بیٹی یعنی میری بیوی کو مونچھ کے بال
طرح عزیز رکھتے ہیں۔ اس لئے تیسرے دن ارشاد ہوا کہ میں بھی اُن کی طر
مونچھیں رکھّوں۔ اور اپنے والدین کو اپنی جگہ اور بیوی کو اپنی جگہ رکھنے کے بجا
ہر جگہ بیوی کو رکھّوں۔ ظاہر ہے مجھ ایسا بیکار نوجوان جو والدین کا دستِ
تھا اور جس نے صرف انھیں کی خوشنودی کی خاطر داماد بننا قبول کیا تھا۔
طرح کی مونچھیں رکھنے کو تیار نہ تھا۔

انکار کیا تو مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولے۔

"میری لڑکی اس طرح وہاں نہیں رہ سکتی۔"

یہ جملہ میری شفیق ساس نے بھی دُہرایا۔

(خدا اُن کے لئے بھی جنّت کے دروازے ہمیشہ کھُلے رکھے)

اور مطالبہ کیا کہ میں فوراً اپنی چاروں بہنوں کو ٹھکانے لگا دوں یعنی اُن
شادیاں کر کے اُن کے شوہروں کے ہاں دفان کر دوں۔ بس چونکہ یہ کارِ نیک ہ

کرائے کا مکان

ا۔ "فرمایئے ؟"

ب۔ "جی میں لالہ کرپارام جی سے ...."

ا۔ "میرا نام ہی کرپارام ہے۔ فرمایئے"

ب۔ "جی میں مکان کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں"

ا۔ "مکان کے سلسلے میں ؟ کون سے مکان کے سلسلے میں ؟"

ب۔ "جی اسی مکان کے سلسلے میں !"

ا۔ "کسٹوڈین کی طرف سے آئے ہیں، عدالت کی طرف سے یا میونسپل کمیٹی کی طرف سے ؟"

ب۔ "جی میں اپنی طرف سے ....."

ا۔ "اپنی طرف سے آئے ہیں تو جایئے"

ب۔ "کہاں ؟"

ا۔ "جہاں سے آئے ہیں۔ میں آپ کو پہچاننے سے انکار کرتا ہوں"

ب۔ "جی میں اپنے آپ کو پہچنوانے نہیں آیا !"

ا۔ "تو اور کیا گل کھلانے آئے ہیں ؟"

ب۔ "جی میں ...."

پڑتا ہے اور اُس کی (یعنی میری) کسی چپراسی تک سے واقفیت نہیں۔"

بہن کی دلجوئی کے لئے دو عدد سالے صاحب آتے ہیں اور آتے ہی متحدہ طور پر بہن کی بجائے پڑوس کی ایک لڑکی کی دلجوئی کرنے لگتے ہیں۔ نوبت دنگے تک آجاتی ہے اور کسی طرح بیچ بچاؤ کرکے میں انھیں بحفاظت واپس بھجوا دیتا ہوں لیکن اُن کے واپس پہنچتے ہی پتہ چلتا ہے کہ لوک لاج نام کی چیز مجھے چھو تک نہیں گئی۔ مجھے اپنی عزت کا خیال ہے نہ خاندان کی عزت کا۔ اور بیوی کے سگے سمبندھی تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔

"ہم اِسے ایسا نہیں سمجھتے تھے!"

میری ساس جب بھی یہاں آتی ہیں اپنی بیٹی کی قابلِ رحم حالت پر آنسو بہاتے ہوئے کہتی ہیں۔

"ہم اِسے ایسا نہیں سمجھتے تھے!"

میرے سسر بھی جب یہاں آتے ہیں تو اپنی بیٹی کی قابلِ رحم حالت پر مونچھیں مروڑتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ہم اِسے ایسا نہیں سمجھتے تھے!"

میرے ساس سسر کے رشتے دار جب یہاں سے ہو کر اُن کے یہاں جاتے ہیں تو اُن کی بیٹی کی قابلِ رحم حالت پر مسکرا مسکرا کر یہی کہتے ہیں۔

اور میں کہتا ہوں ....

"میں کہہ ہی کیا سکتا ہوں ——— !"

ب۔ "اور کہا تھا کہ آپ کے تین بچّوں کو مفت پڑھانا ہوگا۔ دونوں وقت آپ کی بوڑھی امّاں کو بھگوت گیتا کا پاٹھ سنانا ہوگا۔ آپ کے چھوٹے بھائی صاحب کی مالش۔۔۔۔"

ا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ معلوم ہوتا ہے رگھو نندن اب کچھ سمجھدار ہوگیا ہے۔"

ب۔ "جی!"

ا۔ "نکالئے کرایہ!"

ب۔ "جی!"

ا۔ "کرایہ نکالئے!"

ب۔ "لیکن لالہ جی مکان؟"

ا۔ "آپ کو کرائے پر مکان چاہئے نا؟"

ب۔ "جی ہاں!"

ا۔ "تو سمجھئے مل گیا۔ آپ جب چاہیں سامان لا سکتے ہیں۔"

ب۔ "جی بہت بہت شکریہ۔ لیکن۔۔۔۔"

ا۔ "پھر وہی لیکن؟"

ب۔ "جی۔۔۔۔ جی آپ نے فرمایا ہے کہ جب چاہوں سامان لا سکتا ہوں۔"

ا۔ "تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو مکان دیئے بغیر آپ سے کرایہ مانگ رہا ہوں؟"

ب۔ "جی نہیں۔ ہیں۔۔۔۔ میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ مجھے مکان کے کس حصّے میں رہنا ہوگا؟"

ا۔ کسی حصّے میں نہیں۔"

ب۔ "جی؟"

ا۔ "میرا مکان خریدنے آئے ہیں ؟"

ب۔ "جی نہیں !"

ا۔ "گروی رکھنا چاہتے ہیں ؟"

ب۔ "جی نہیں !"

ا۔ "گروانے کا ارادہ ہے ؟"

ب۔ "جی نہیں !"

ا۔ "تو پھر کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں ؟"

ب۔ "جی میں کرائے پر مکان لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں !"

ا۔ اوہ، "تو آپ کو کرائے پر مکان چاہیئے ؟"

ب۔ "جی !"

ا۔ "کس سالے نے آپ سے کہا ہے کہ میرے پاس مکان خالی ہے اور میں اسے کرائے پر۔۔۔۔۔"

ب۔ "جی آپ کے سالے صاحب نے فرمایا تھا۔ دراصل ہم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں۔ مجھے مکان کی ضرورت تھی۔ انھوں نے۔۔۔"

ا۔ "ہوں، تو آپ سے رگھو نندن نے کہا ہے ؟"

ب۔ "جی ہاں !"

ا۔ "رگھو نندن نے کچھ اور بھی کہا تھا آپ سے ؟"

ب۔ "جی ہاں کہا تھا کہ ساٹھ روپے کرایہ ہو گا۔ کرایہ ہر مہینے پیشگی دینا ہوگا۔"

ا۔ "یہ بھی کہا تھا کہ رسید نہیں ملے گی ؟"

ب۔ "جی ہاں یہ بھی کہا تھا۔"

ا۔ "اور کیا کہا تھا ؟"

ب۔ "لیکن لالہ جی! مجھے تو رگھونندن نے....."

ا۔ "رگھونندن ابھی بچہ ہے۔ اِن باتوں کو نہیں سمجھتا۔ کبھی کوئی بلڈنگ کھڑی کرے گا تو پتہ چلے گا۔"

ب۔ "لیکن لالہ جی! اس بلڈنگ میں تو بہت سیلن ہے۔ میرا مطلب ہے اگر گرمی کے اِس زمانے میں اس میں اِتنی سیلن ہے تو برسات میں تو یہاں مچھلیاں پکڑی جاسکیں گی۔"

ا۔ "مچھلیاں! یہ آپ نے نئی بات سُجھائی۔ ٹھیک ہے۔ برسات کے زمانے میں آپ کو نوّے کے بجائے پورے سو روپے کرایہ دینا ہوگا۔ مچھلیاں پکڑ کر آپ بیچ سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"



ا۔ "جی ہاں جناب! یہ میرا مکان ہے۔ میرا مطلب ہے اس مکان میں میں خود رہتا ہوں۔ آپ وہاں اُس سامنے کے مکان میں رہیں گے۔"

ب۔ "سامنے کے مکان میں؟ وہ تو اصطبل ہے لالہ جی۔"

ا۔ "ہاں، جب آپ سامان لے کر آئیں گے تو گھوڑے وہاں سے ہٹا دیئے جائیں گے۔"

ب۔ "لیکن...."

ا۔ "اب زیادہ لیکن ویکن مت کیجیے۔ مکان آپ کو لینا ہے تو کرایہ نکالیے!"

ب۔ "لیکن لالہ جی! اِس اصطبل میں کوئی کیسے رہ سکتا ہے۔ اِس میں نو کوئی کھڑکی ہے نہ روشندان!"

ا۔ "روشندان؟ گھوڑوں کو آپکے خیال میں روشندانوں کی ضرورت ہوتی ہے؟"

ب۔ "لیکن اب تو اِس میں میں رہوں گا لالہ جی!"

ا۔ "تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر آپ ضروری سمجھیں گے تو جو کہیں گے لگ جائے گا۔ دروازے، کھڑکیاں، روشندان...."

ب۔ "شکریہ! بہت بہت شکریہ!"

ا۔ "لیکن اس صورت میں کرایہ آپ کو ساٹھ کے بجائے ستّر دینا ہوگا۔"

ب۔ "جی!؟"

ا۔ "جی ہاں ستّر! اور اگر آپ نل لگوانا چاہیں گے تو اسّی!"

ب "جی؟"

ا۔ "اور بجلی لگوانا چاہیں گے تو نوّے!"

ب۔ "جی!"

ا۔ "اور ان سب کے لگوانے کا خرچ آپ کو اپنی گرہ سے دینا ہوگا۔"

شکر ہے —— میرے حال پر ویسے ہی رحم فرمایئے۔ کہہ کہہ کچھ کرایا تو لعنت ہے ایسے کرانے پر —— ہاں ہاں، اس وقت آپ ٹھیک ہی میری کمر دبائیں گے۔ یہ چلے کسی اور کو دیجئے گا —— ہم ان پھیروں میں آنے کی نہیں —— اے واہ کمال ہے —— یہ ہم نے کب کہا کہ آپ کو ہمارا کوئی خیال نہیں —— تو پھر یونہی آپ ہمارا خیال نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا —— آپ کے بغیر ہمارا یہاں ہے ہی کون؟ —— نہیں جی نہیں —— نہیں سویا ابھی، پڑے پڑے بس باتیں بنانا آتی ہیں —— ذرا آدھ گھنٹے کے لئے سنبھالنا پڑ جائے تو پتہ چل جائے —— نانی یاد آجائے —— جی؟ جی آپ خود ہی دیکھ لیجئے —— مجھ پر تو کبھی آپ کو یقین نہیں آتا —— ذرا سا ہلتی ہوں تو سرک سرک کرنے لگتا ہے —— بڑا چالاک ہو گیا ہے اُلّو —— کیوں نہ ہو —— بیٹا کس باپ کا ہے —— باپ نے کبھی پیروں پر پانی نہیں پڑنے دیا تو بھلا بیٹا.... اوہو، اسے سونف کا کروا دینا تو میں بھول ہی گئی —— بھگوان شکھ رکھے۔ بچوں کا تو بس وہی رکھوالا ہے ——

جی، میں نے کہا، کل اسے ذرا ڈاکٹر کو تو دکھلایئے۔ اب تو کوئی دانت داڑھ بھی نہیں پھنسی ہوئی۔ پھر نہ جانے اسے کیوں دست لگ گئے ہیں —— جی ہاں آٹھ دس آچکے ہیں صبح سے —— ہاں ہاں صبح ہی اور کیا میں آپ کو اسی وقت کھڑے پاؤں لے جانے کو کہہ رہی ہوں —— !

دیکھا! پھر کہتے ہیں کہ مجھے کہتی ہے۔ بچے کی تو آپ کو ذرا بھی پروا نہیں۔ بالکل لہو سفید ہے آپ کا —— صبح دیکھا جائے گا، ہونہہ! دنیا ان چیزوں کا منہ دیکھنے کو ترستی ہے اور ایک ہمارا گھر ہے جہاں —— کیا کہا؟ جی ہاں، میں اسی طرح رائی کا پہاڑ بناتی ہوں۔ آپ کو نہ ہوگا درد —— میرے تو جسم کا ٹکڑا ہے —— اس وقت تو کہتے تھے —— ہائے لڑکا ہی ہو، لڑکا ہی ہو، لڑکی ہوئی تو رہنا

دو باتیں

جی نہیں —— نہیں سویا ابھی —— ذرا دم تو لیجئے، میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی ؟ تھپکیاں دے دے کر تو میری باہیں بھی ہار گئی ہیں —— اچھا جی اچھا —— میں ہی نہیں سونے دیتی اسے۔ آپ سلا لیں آکر، مجھے کچھ زیادہ پڑی ہے، آدمی میں کچھ تو صبر سنتوکھ ہونا چاہئے —— دس دفعہ کہہ چکی ہوں، دودھ پی رہا ہے، دودھ پی رہا ہے لیکن آپ ہیں کہ —— اوں ہوں، ذرا آہستہ بولئے، جاگ جائے گا کم بخت ! اور پھر کوئی سنے گا تو کیا کہے گا ؟ کیا کہا ؟ سننے دوں ؟ آپ کو کسی کی پروا نہیں —— ٹھیک ہے اور زور سے چلّائیے۔ اکٹھا کر لیجئے محلّے بھر کو —— میری جان بھی اچھی مصیبت میں پڑی ہے۔ ادھر یہ نوچ نوچ کو کھا رہا ہے اُدھر یہ ہیں کہ اے جی سننا میری بات —— اے جی ذرا ادھر تو آؤ —— اے جی نہ ہوئی نگوڑی کا بٹہ ہو گئی ——

دن بھر گھر کے کام کاج میں کمر ٹوٹ جاتی ہے —— بیل کی طرح جُتی رہتی ہوں اور رات پڑتی ہے تو —— ہمیں تو کبھی کسی نے پھوٹے مُنہ سے اتنا تک نہیں کہا کہ لاؤ ذرا تمہاری کمر ہی داب دیں، تھک گئی ہو گی —— جی مہربانی ——

ورنہ آپ تو ہمارا گلا گھونٹنے میں بھی دریغ نہ کریں ___ کیا کہا؟ ذرا اونچی زبان سے کہیئے ___!

آجائے گا سوٹ ___ جی ہاں آسمان سے آجائے گا سوٹ! دو مہینے سے نہ آگیا؟ یہاں تو اپنے سوٹ بوٹ اور نکٹائیوں سے غرض ہے۔ دوسرا چاہے چیتھڑے پہنے چاہے ننگا پھرے ___ ٹرنک! کونسا ٹرنک؟ جی ہاں کیا کہنے ہیں لہر بہر لگی ہوئی ہے۔ ٹھسے پڑے ہیں ٹرنک میرے پاس کہتے شرم بھی نہیں آتی۔ ہم تو شروع سے یہی موٹا جھوٹا پہن رہے ہیں ایک نگوڑی ساٹن ___ نانا بڑے سلوا دیئے ہیں نا، اطلس اور کمخواب کے سوٹ ___ تو میں کوئی جھوٹ کہتی ہوں ___ تو پھر اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے ___ اچھا بابا بخشئے۔ آپ سے دو بدو لڑنے کی ہمت مجھ میں نہیں۔ بس آج کا دن یاد رکھئے۔ میری زبان جل جائے۔ منھ میں کیڑے پڑیں جو کبھی کسی چیز کا نام لے جاؤں۔ اب تو کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا نا ___ آپ تو چاہتے ہی ہیں کہنے سننے والا کوئی نہ ہو اور گلچھرے اڑاتے پھریں۔ لیکن ہماری جان کیوں سولی پر ٹانگ رکھی ہے۔ ایک دل ہزار داغ۔ دنیا غلط نہیں کہتی کہ سخت سے نباہ ہو جاتا ہے، اکھڑ سے نہیں، آپ تو اکھڑ ہیں اکھڑ۔

دیکھیے، آج پھر آپ نے میرے ماں باپ کا نام لیا۔ پھر کہتے ہیں کہ ___ میں پوچھتی ہوں کیا بگاڑا ہے آپ کا ان بے چاروں نے؟ میرے ماں باپ تو آپ کی آنکھوں کا کانٹا ہو گئے۔ جس وقت دیکھو، تمہاری ماں، تمہارا باپ، تمہارا باپ تمہاری ماں ___ ہے کوئی ادب لحاظ آپ کے دل میں ___ اچھا جی کوئی ٹھیکہ تو لے نہیں رکھا انھوں نے جتنا بن آئے گا اتنا ہی دیں گے۔ اپنے کپڑے اتار کر نہیں دے دیں گے وہ۔ آپ کی بلی تو بہنیں ہیں، دیکھ لوں گی کون ہاتھی گھوڑے کھول دیں گے آپ۔ آدمی اپنے گریبان میں منھ ڈال کر نہیں دیکھتا۔ یہ میں ہی ہوں جو دل پر پتھر رکھ کر سہے جاتی ہوں۔

وہیں اپنے ماں باپ کے گھر — اور اب اگر ایشور نے منھ مانگی مراد دی ہے تو اس طرح دھتکار رہے ہیں جیسے کسی چمار کا لڑکا ہو۔ آپ سا طوطا چشم بھی کوئی ہوگا!۔ کون دھتکارتا ہے؟ آپ اور کون؟ یہ دھتکارنا نہیں تو اور کیا ہے؟ کبھی گھڑی بھر کو آپ کو دیا نہیں کہ ٹسں ٹسں کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ لو جی ہیں تو نوکر ہی سمجھ لیا ہے۔ مردوں کو بچے کھلاتے کبھی نہیں سنا —— بڑی نوکرانیاں رکھ دی ہیں نا میری اردلی میں! میں کہتی ہوں، آپ اسے یوں نہ کھلائیں۔ میں اسے یوں نہ کھلاؤں تو پھر کون کھلائے گا اسے؟ یہ بھی کہتا ہوگا کس منحوس گھر میں جنم لے لیا میں نے ——

جی رہنے دیجیے، مجھے غصہ مت دلائیے۔ نہیں آتی میں —— میں آپ کی کون ہوں اگر میرے بچے کو آپ کچھ نہیں سمجھتے —— ہاں، ہاں ٹھیک ہے —— آپ مجھ سے بھولے ہوئے نہیں ہیں۔ کالا سیاہ دل ہے آپ کا۔ کیا مجال جو کٹی انگلی پر پھونک بھی مار جائیں —— یاد ہے نا وہ ساٹن کا سوٹ۔ آج آج کل کل کرتے دو مہینے ہونے کو آئے ہیں اور کپڑے کے نام پر ایک کترن تک لا کر نہیں دی۔ میں تو آپ کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اپنی کوئی چیز لانی ہوتی پھر دیکھتی کیسے رات بھی پڑنے دیتے ہیں۔ لیکن یہاں تو وہ بات ہے کوئی مرے کوئی جیے ستھرا گھول بتاشے پیئے ——

آج رام لبھائی پھر پوچھنے لگی کہ سناؤ بہن کیا ہوا وہ تمہارا سوٹ؟ تم تو بڑی اتراتی پھر رہی تھیں —— جی جل کے کوئلہ ہو گیا۔ ان کے بھی گھر والے ہیں۔ دیکھتی ہوں آگے پیچھے پھرتے ہیں اپنی گھر والیوں کے۔ زبان پر کسی چیز کا نام آیا نہیں کہ حاضر۔ ہر روز لدے پھندے آتے ہیں۔ لیکن یہاں کوئی گھر کو گھر سمجھے جب نا۔ کیا کہا؟ آپ زن مرید نہیں ہیں —— جی ہاں، آپ کیوں زن مرید ہونے لگے میں ہی زر خرید لونڈی ہوں آپ کی۔ موم کی ناک جدھر چاہا موڑ لیا۔ آپ کا تو بس ہی نہیں چلتا

کوئی کور کسر نہ رہ جائے باقی۔ باندھ کے ڈال دیجئے اندر۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیجئے ——— جانے دوں؟ کیسے جانے دوں؟ آپ جانے دینے والی بات کرتے ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ آپ کو مرد کس نے بنا دیا۔ آپ تو عورتوں کے بھی کان کترتے ہیں۔ ساس نندیں بھی اس طرح طعنے تشنے نہیں دیتیں جس طرح تڑتڑ آپ کی زبان چلتی ہے ——— جی رہنے دیجئے ہمیں ایسے نخرے بگھارنے نہیں آتے۔ سب کچھ کہہ بھی دیا اور پھر بچے کے سچے۔ میں کہتی ہوں جس گھر میں عورت کی عزت نہیں، اس گھر میں ——— اب نہ کہیں گے؟ کیوں اب کیوں نہیں کہیں گے؟ اب کونسی بلی چھینک گئی ہے۔ یہ تو روز ہی کا رونا ہے۔ کوئی نئی بات ہو تو آدمی کہے چلو کبھی منہ سے نکل گئی ہوگی ——— لیکن ——— آپ کی نظر میں ہم انسان تھوڑی ہیں۔ لوہے کی چھاتی ہے ہماری ——— کیا کہا؟ میں کہتی ہوں تو غصہ آجاتا ہے۔ میں کیا کہتی ہوں؟ آپ میرے سر کی قسم کھا کے کہئے۔ میں نے آج تک آپ سے کچھ کہا ہے۔ یہ آپ ہی ہیں، جب تک دس سنا نہ لیں کھانا ہضم نہیں ہوتا ——— جی نہیں، مہربانی۔ مجھے نہیں چاہیئے سوٹ ووٹ۔ واہ! کیسے لے آئیں گے آپ۔ کوئی مذاق ہے۔ لاکر تو دیکھئے آپ کے سامنے ریزہ ریزہ نہ کر دیا تو۔

نہیں، اس میں غصے کی کیا بات ہے اور مجھے غصہ کر کے کسی سے لینا ہی کیا ہے میں کم بخت تو خود ہی نصیب جلی ہوں۔ کسی کا کیا قصور۔ ہوتی نا میں اپنی ماں کے گھر۔ ذرا زبان ہلا دیتی، ایک چھوڑ پچاس سوٹ آجاتے ———

نہیں، اس میں امیری غریبی کا کیا سوال ہے اپنی اپنی قدر دانی کی بات ہے۔ اچھا تو پھر یونہی سہی ——— کچھ بھی ہو اتنے گئے گزرے نہیں ہیں وہ کہ بیٹی کے لئے ایک سوٹ ——— لیکن کیوں، کیوں کہوں میں ان سے۔ آپ کس مرض کی دوا ہیں۔ شرم نہ آئے گی آپ کو؟ لیکن آپ کو کیا ——— شرم و حیا تو سب گھول کر پی چکے ہیں

ہوتی نا کوئی دوسری میری جگہ ناک میں دم کر دیتی۔ آپ کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ک
بھاؤ بکتی ہے —— جی ہاں، اِسی طرح مروڑ اُٹھتے ہیں سچی بات پر۔ اب میں کچھ ک
گی تو بُرا مان جائیں گے کہ ہیں ہیں میری ماں کو کہتی ہے۔ نا، نا بتائیے، آخر کیا نہ
میرے ماں باپ نے۔ ایک سے ایک بڑھیا سُوٹ تھا۔ ہمارا تو جاؤ بھی پورا نہ ہو
بھی دل پر نہیں لگائی۔ کہتی ہوں کیا ہوا، میں نے پہن لئے یا نندوں نے ایک ہی
ہے۔ لیکن آخر میرا بھی تو دل ہے، میں بھی کسی ماں کی جائی ہوں۔ بڑے پڑے جا
چاٹ جائیے لیکن آپ کی ماں —— کیا؟ کیا کہا —— ؟ کچھ نہیں کہا؟ بڑی خوشی
کچھ نہ کہیئے میں بھی آپ سے کچھ کہوں گی تو کہیئے گا —— پھر کہتے ہیں کہ جی میں تو کچھ
ہی نہیں، تم ہی لڑنے کے بہانے ڈھونڈتی ہو۔ بڑے بھولے بنتے ہیں۔ منہ میں جیسے
ہی نہیں —— اور یہ مُنھ بھر بھر کے کوسنے اور گالیاں —— نا، آپ ہی کہیئے میرا جی
کوئی جینا ہے۔ نہ کوئی کام کا زیور نہ ڈھب کا کپڑا لتا۔ دن رات ایک کرتی ہوں
روٹیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کا سلوک تو کوئی گھر کے نوکروں سے بھی نہ
کرتا —— ہاں ہاں نوکر —— میں نوکرانی ہی تو ہوں ——

دیکھئے آپ پھر —— میں پھر کہتی ہوں مجھے چاہے جو جی میں آئے کہ
لیکن میرے ماں باپ کو —— نہ جانے آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔ میں نوکر
نہیں پلی نہ سہی، آپ کے گھر میں تو درجنوں نوکر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہو
نہ کیوں نہ کہوں میں —— میں کہوں آپ کے ماں باپ کو کچھ، پھر دیکھو کیا گت
ہے میری۔ آپ تو گھر میں پانی تک نہ پینے دیں۔ کھڑے کھڑے نہ نکال دی جا
تو —— واقعی کسی کے گھر بیٹی پیدا نہ ہو۔ جب تک کنواری رہے گی یوں
سوکھتی رہے گی کہ ہائے کسی کی انگلی نہ اُٹھ جائے۔ کوئی کچھ کہہ نہ دے اور جب بر
جائے گی تو اور بھی —— اچھا تو، ابھی آپ نے کچھ کہا ہی نہیں —— اور کہہ

بی جمالو

بی جمالو کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ بی جمالو، بی جمالو ہیں اور کہاں نہیں رہتیں؟ لیکن موٹی عقل کے لوگوں کی تعداد چونکہ فی زمانہ حضرت نوحؑ کے زمانے سے بھی زیادہ ہے۔ اور باریک عقل کے لوگ آج کے زمانے میں بھی اختصار کی نسبت تفصیل کے قائل ہیں۔ اس لئے تشریح کے طور پر عرض ہے کہ بی جمالو آپ کے اغل کے مکان میں یا بغل کے مکان میں یا ٹھیک آپ ہی کے مکان میں رہتی ہیں۔ شکل وصورت کے اعتبار سے بھی اُن میں اور دنیا کی کسی اور عورت میں شکل وصورت کے سوا اور کوئی فرق نہیں۔ عمر کا فرق بھی اُن کے بی جمالو ہونے یا نہ ہونے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ وہ اٹھارہ برس کی بھی ہو سکتی ہیں اور اٹھاون برس کی بھی۔ زبان وہ ہر قسم کی بولتی ہیں۔ لباس وہ ہر قسم کا پہنتی ہیں۔ اور انھیں ہر ملک اور ہر قسم کی آب وہوا راس ہے۔ عام عورتوں میں اور بی جمالو میں اگر کوئی فرق ہے اور یہ کوئی معمولی فرق نہیں ہے کہ جہاں عام عورتیں ہر وقت لڑنے جھگڑنے پر آمادہ رہتی ہیں، وہاں بی جمالو ایک ایسی نیک بی بی ہیں کہ اِدھر اُن کے کان میں لڑائی جھگڑے کی بھنک پڑتی ہے اُدھر لپک کے وہ اپنے

آپ ہیں اگر کل کو بھیک مانگنے لگوں تو بھی کہیں گے، چلو اچھا ہوا۔ جان بچی، مجھ سے تو
کچھ نہ مانگے گی ——— ہاں ہاں، بڑے شوق سے سو جائیے۔ میں تو آپ کے پاؤں
نہیں پڑ رہی۔ یہ تو وہ بات ہوئی کہ چوری بھی اور چترائی بھی۔ ہر بات میرے سر تھوپنے
کی تو آپ کی پرانی عادت ہے ——— کملا کی شادی؟ کملا کی شادی قریب آ رہی ہے
تو آپ کی بلا سے۔ آپ کو کسی سے کیا لینا دینا ہے ——— یہ چالیں کسی اور سے چلیے گا
——— اب اور کچھ نہیں سوجھا تو ——— نہیں جی نہیں، مجھے نہیں جانا وہاں ———
بہن ہے تو کیا ہوا، میری ہی تو بہن ہے، سمجھ لے گی مر گئی بڑی بہن ——— اور کیا
دانت دکھانے تو نہیں جانا وہاں کہ لو جی آ گئے ہیں باہیں لٹکاتے، اپنا آپ لے کر
لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا ہمیں تو آتا نہیں۔ ——— پھر وہی ٹرنک؟ لے دے کے ایک
مسٹر اسپنیل کا سوٹ پھدکتا پھرتا ہے۔ ایڑیوں سے اونچی شلوار اور ٹخنوں میں گرتا ہوا
جسے نہیں ہنسنا وہ بھی ہنسے کہ دیکھو بہن کی شادی میں کیا نمونہ بن کر آئی ہے۔ پھر ایک با
نہیں، دو بار نہیں، پچاسوں بار وہی جھول کا جھول پہن کر وہاں جا چکی ہوں ——— وہ بھی
کیا کہتے ہوں گے دل میں، اور میں تو کسی سے کچھ کہتی سنتی ہی نہیں۔ کہتی ہوں کیا فائدہ
ایسا الکھ لٹ نہیں ہے کہ ——— پچھلی بار تو پتا جی نے پوچھ بھی لیا تھا لیکن یہ میں ہی ہو
جو ہمیشہ آپ کی عزت رکھتی آئی ہوں۔ کاٹھ مار جائے جو کبھی بھولے منہ سے اُن سے کہا
کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔ پوچھتے بھی ہیں تو کہہ دیتی ہوں، نہیں، مجھے کسی چیز کی ض
نہیں بھگوان کی دیا سب کچھ ہے۔ اب ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ یہاں ایک ایک پیسے
کے لیے بیس بیس بار جوتیاں سونگھنی پڑتی ہیں۔ میں تو بس کسی چیز کا نام لے لوں ——— ہول
اٹھتے ہیں کہ ہئی یہ مانگ رہی ہے اسے تو وہاں مارو جہاں پانی نہ ملے۔ اب کیوں نہیں بو
جواب دیجیے نا ——— اب کیوں منہ میں گھنگھنیاں ڈال لیں ——— میں نے کہا سن رہے ہیں
یا سوٹ کا نام لیتے ہی سو گئے ——— ہے بھگوان میرا بھی کس مردے سے پالا پڑا ہے۔ دن بھر اچک
کے راستہ دیکھو اور آتے ہی خراٹے لینے لگتے ہیں۔ کھل کر دو باتیں بھی نہیں کرنے دیتے۔ . . .

"بتانے میں کیا حرج ہے بُوا، آخر پتہ تو چلے، کون کم ذات ہے جو ہمیں دیکھ نہیں سہاتی؟"

بی جمالو نے اپنا نام نہ لینے اور لڑائی جھگڑے سے باز رہنے کا وعدہ لے کر محترمہ 'د' کے کان میں کچھ کہا اور پھر یہ کہتے ہوئے کہ "میری عادت تم جانتی ہو مجھے لگائی بُجھائی نہیں آتی۔ اور میں تو تم سے بھی کہتی ہوں خاک ڈالو اِن بُھک مردوں پر۔ گدھوں کے چاہنے سے بھینسیں نہیں مرا کرتیں"، جُوتی پہنی اور شام کو پھر آنے کا وعدہ کر کے اپنے مکان میں جا دُبکیں۔

بی جمالو اپنے مکان میں اس لئے نہیں جا دُبکی تھیں کہ تھوڑی دیر پہلے محترمہ 'ب' کے یہاں ٹھونس ٹھونس کر برفی اور قلاقند ڈکارنے کے بعد محترمہ 'د' کی دال بیجی نے اُن کے معدے میں گرانی پیدا کر دی تھی۔ جی نہیں یہ بات نہیں تھی۔ بی جمالو کا معدہ اب بھی ایسا چاق و چوبند تھا کہ اگر موقع ہوتا تو وہ محترمہ 'ج' کے یہاں جا کے سیر آدھ سیر جلیبیاں بھی چکھ سکتی تھیں۔ پر ہُوا یوں کہ اُن عورتوں کا جو بالکل عورتیں نکلیں۔ ہزار وعدوں کے باوجود فوراً دو دو ہاتھ کرنے پر اُتر آئیں۔ اور بے چاری بی جمالو کو چار و ناچار جا کے مکان میں دُبکنا پڑا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے محترمہ 'د' کے کان میں اور اس سے پہلے محترمہ 'ب' کے کان میں امن و آشتی کی کون سی پھُونک ماری تھی۔

میرے اس بیان سے اگر آپ یہ سمجھے ہوں کہ بی جمالو کو برفی، قلاقند دال بیجی، جلیبیاں وغیرہ لذیذ چیزیں کھانے کا چسکا ہے اور اسی لئے وہ ہر ڈیوڑھی پر پہنچتی ہیں تو آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ بات صحیح نہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ عام عورتوں میں مقبول اور ممتاز ہونے کے لئے بی جمالو اپنی نصیحتوں کے بیش بہا موتی اِدھر اُدھر لُٹاتی پھرتی ہیں۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے اور یہ صحیح

مکان میں جا دھمکتی ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے اُن کا ایسا جی جلتا ہے کہ اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے وہ اپنے پاس پڑوس کی عورتوں کو لڑائی جھگڑے سے دُور رہنے کی تلقین کرتی رہتی ہیں۔ اُن کی یہ تلقین اتنی پیاری اور سُلجھی ہوئی ہوتی ہے کہ ا، ب، ج، د۔ ہر عورت نہ صرف اُن کی ایک ایک بات بڑی توجہ سے سُنتی ہے، نہ صرف طرح طرح کی چیزوں سے اُن کی خاطر و مدارات کرتی ہے بلکہ یہ ناممکن العمل وعدہ بھی کر لیتی ہے کہ عورت ہونے کے باوجود وہ عورت ہونے سے یعنی لڑنے جھگڑنے سے پرہیز کرے گی۔ مثال کے طور پر بی جمالو محترمہ "د" کے یہاں پہنچتی ہیں اور دال بیجی اور چائے نوش فرمانے کے ساتھ فرماتی ہیں "اے بہو! ہم تو اس روز روز کی کِل کِل سے تنگ آ لیے۔ کسی میں صبر سنتوکھ ہی نہیں۔ اب تمہارا میاں اگر چہ سو پاتا ہے اور تمہارے آنگن میں بچے کھیلتے ہیں تو اس میں دوسروں کے جلنے کی کیا بات ہے؟"

اِس بات پر محترمہ "د" پلیٹ میں اور دال بیجی ڈالتے ہوئے جواب دیتی ہیں "اور کیا — اپنی اپنی قسمت ہے بوا۔ ہم تو کسی سے نہیں جلتے"۔

"تم کیوں جلو بہو" بی جمالو نے بڑھاوا دیا۔ "بھگوان کا دیا سب کچھ ہے تمہارے پاس۔ دودھ، پوت، دھن، دولت کیا ہے جو تمہارے پاس نہیں؟"

محترمہ "د" نے خوش ہو کر ٹوکری کی بچی کھچی دال بیجی پلیٹ میں جھاڑتے ہوئے اور پلیٹ کو پھر سے بی جمالو کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

"پر یہ تو بتاؤ بُوا اب کس کے کلیجے میں پیڑ اٹھی ہے!"

"اے بہو!" بی جمالو نے کہا "جلنے والوں کو جلنے دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے۔ تم کیوں اپنا جی کڑھاتی ہو؟"

محترمہ "د" نے اپنا جی نہ کڑھانے کی قسم کھاتے ہوئے بی جمالو سے کہا

دو ہتھڑ مارا اور جس طرح زلزلہ صورت تشریف لائی تھیں زلزلہ صورت واپس تشریف لے گئیں۔ اِس زلزلائی آمد و رفت سے میرے اوسان ابھی بجا بھی نہ ہوئے تھے کہ بالکل خطا ہو گئے۔ نیچے آنگن میں میری بیوی اور میری بہن میں چین کی بنسی بجانے کا ایسا شاندار مقابلہ شروع ہو گیا تھا اور ایسے ایسے بدلتے بل کھاتے آلاپ نکل رہے تھے کہ کوئی بڑے سے بڑا موسیقار بھی ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔

جو ایک آدھ دھن اس ہیجاں کے پلّے پڑ سکی اُسے مکالمے کی صورت میں اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے۔

میری بیوی۔ " تو کون ہوتی ہے؟"

میری بہن۔ " تو کون ہوتی ہے؟"

بیوی۔ " میں سب کچھ ہوتی ہوں "

بہن۔ " میں سب کچھ ہوتی ہوں "

بیوی " تُو کچھ نہیں ہوتی!"

بہن " تُو بھی کچھ نہیں ہوتی!"

بیوی " میں اُن کی بیوی ہوتی ہوں!"

بہن " میں اُن کی بہن ہوتی ہوں!"

غرض یہ کہ چین کی بنسی آج صبح سے اب تک مسلسل بج رہی ہے بیچ بیچ میں ذرا دیر کے لئے رُک جاتی ہے لیکن پھر اس سے بھی زیادہ شد و مد سے بجنے لگتی ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ یہ بنسی کافی دنوں تک بجتی رہے گی۔ لیکن بجانے والیوں میں سے کوئی بھی نہیں بتائے گی کہ اسے بنسی بجانے کی ترغیب یا تحریک کہاں سے

بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ بی جمالو کو لڑائی جھگڑے سے سخت نفرت ہے اور جب تک دو چار گھروں میں وہ اپنی اس مقدس نفرت کا اظہار نہیں کر آتیں، انھیں چین نہیں پڑتا۔ ہر طرف اور ہر وقت چین کی بنسی بجتے دیکھنے کی اُنھیں بڑی تمنّا رہتی ہے۔

دُور جانے کی ضرورت نہیں، خود میرے مکان کے اغل کے یا بغل کے مکان میں ایک عدد بی جمالو رہتی ہیں۔ انھوں نے جب دیکھا کہ کئی دن سے ہمارے گھر میں چین کی بنسی نہیں بجی تو اُنھیں اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ کوتاہی کا احساس ہونے کی دیر تھی کہ چین کی بنسی میں پھونکیں بلکہ جھنکاریں پڑنا شروع ہوگئیں۔ ہوا یوں کہ آج صبح میں اپنے کمرے میں بیٹھا شاید کچھ پڑھ رہا تھا۔ یا لکھ رہا تھا۔ اونگھ رہا تھا یا سو رہا تھا کہ ایک دم جیسے زلزلہ آگیا۔ چونک کے اور بوکھلا کے دیکھا تو زلزلہ تو نہیں، زلزلہ صورت بیوی صاحبہ کمرے میں تشریف رکھتی تھیں۔ بے ترتیب لباس، اُس سے بے ترتیب بال۔ اور چہرہ تو ایسا بے ترتیب تھا کہ دیکھے سے خدا کی قدرت یاد آتی تھی۔

"سُنا تم نے؟" بیوی نے کڑک کر کہا، "تم نے کچھ سُنا؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا "ابھی ابھی میں نے زلزلہ آنے کی آواز سُنی تھی!"

"تم نے خاک نہیں سُنا" بیوی نے اور بھی کڑک کر بلکہ دہاڑ کر کہا "تم نے تو کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے۔ میں اب اس گھر میں نہیں رہ سکتی"

"تو کیا مضائقہ ہے" میں نے بہت ملائمت سے کہا "چند دنوں کے لئے اپنے میکے ہو آؤ۔ آدمی زیادہ دنوں تک ایک جگہ رہے تو طبیعت اُکتا ہی جاتی ہے!"

بیوی نے میری اِس بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی چھاتی پر ایک

جنتر منتر

یہ کہنا تو کچھ زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ ہماری زندگی شروع سے بڑے اطمینان سے گزر رہی تھی اور ہمیں کبھی کوئی بیماری ہوئی تھی نہ دل میں دولت یا شہرت حاصل کرنے کی تمنا، البتہ یہ کہنا ایک حد تک ضرور صحیح ہوگا کہ ہمیں جب بھی کوئی بیماری ہوئی ہم نے فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ کسی لاٹری وغیرہ کے ذریعے سستی دولت حاصل کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنے دس ناخنوں کی طرف دیکھا اور شہرت کے لئے کسی آسان نسخے کی ضرورت ہم نے اس لئے محسوس نہ کی کہ پہلے سے حاصل شدہ شہرت ہی ہمارے لئے کم عبرت ناک نہ تھی اور یہ تو سو فیصدی صحیح ہے کہ آج سے چند ماہ پہلے تک ہم کبھی طلسمات کے چکر میں نہ پڑے تھے اور علم غیب کے علمبرداروں یعنی جوتشیوں اور رمالوں کو دیکھتے ہی ہمیں بے اختیار ہنسی آجایا کرتی تھی۔ لیکن اپنی تمام تر ہوش مندی کے باوجود قسمت میں طلسم ہوشربا لکھا تھا یا نہ جانے کیا لکھا تھا کہ ایک دن خلافِ معمول ہم نے اخبار میں نہ صرف کئی کالموں کا ایک طلسماتی اشتہار لفظ بہ لفظ پڑھ ڈالا بلکہ شری ۱۰۸ سوامی بھبوتی نند بھوشن وکتا کو، جنھیں پوری دنیا کو سکھی اور خود کو دکھی دیکھنے کی حسرت جنون کی حد تک تھی اور جنھوں نے صرف اشتہار کے کاغذ اور چھپائی کا خرچہ پورا کرنے کے لئے اپنے

ٹی۔ اور اس سارے دھوم دھڑاکے کی اصل وجہ کیا ہے ؟"

بی جمالو کی ایک خوبی جہاں یہ ہے کہ وہ بہت امن پسند ہیں اور لڑائی جھگڑے کے قریب نہیں پھٹکتیں۔ وہاں ایک خوبی اُن میں یہ بھی ہے کہ وہ لڑنے جھگڑنے والی عورتوں کو کبھی اپنے نام کے قریب نہیں پھٹکنے دیتیں۔ اور اس حیثیت سے میں سمجھتا ہوں بی جمالو کا درجہ ہندو مائتھالوجی کے نارد مُنی سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر کبھی نارد مُنی جی کو دیولوک سے اُتر کر ہماری اِس زمین پر تشریف لانے کی توفیق ہوئی اور یہاں اِس مٹی کے پتلے۔ بی جمالو کی بجائی ہوئی چین کی بنسی کے تان پلٹے اُن کے کان میں پڑ گئے تو وہ اپنا ستارہ بجانا بھول کر بغلیں بجاتے واپس دیولوک کی راہ لیں گے۔



موسم سردی کا تھا پھر بھی حسب ہدایات رات کو سات بار نہا کر اور جنتر کو سات بار ڈنڈوت پرنام کر کے آنکھ، ناک، کان وغیرہ جسم کے ہر اہم حصے سے لگایا اور بڑی احتیاط سے سرخ رنگ کے کپڑے میں لپیٹ کر سرہانے رکھ کے سو گئے۔ جنتر کے پہلے کرشمے یا پہلی قسط کے طور پر ہمیں آج خواب میں گڑی ہوئی دولت نظر آنے والی تھی اور ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی جب صبح کو گھر کے لوگوں کے علاوہ اڑوسیوں پڑوسیوں نے بھی جنتر کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے گواہی دی کہ رات بھر نہ صرف ہم کسی نامعلوم جگہ کا نام لے کر بڑبڑاتے اور چیختے رہے ہیں بلکہ چارپائی پر گز گز بھر اُچھلتے بھی رہے ہیں۔

گڑی ہوئی دولت کی جگہ کو سب کے اصرار پر بار بار ذہن میں لانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ادھر رات بھر اُچھلنے اور چیخیں مارنے کی وجہ سے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن یار لوگوں نے اسے بھی جنتر کی کرامت سمجھی اور ڈاکٹر بلانے کی ہماری التجاؤں پر عمل کرنے کے بجائے ہماری بیوی کو، جسے ہماری نسبت اب ہمارے ذریعے گڑی ہوئی دولت حاصل کرنے کی فکر زیادہ لاحق ہو گئی تھی، بذریعہ تار شری ۱۰۸ سوامی جی کو تمام حالات سے آگاہ کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ پرچہ ترکیب استعمال میں اس کی خاص طور سے ہدایت کی گئی تھی۔

شام ہوتے ہوتے ہماری حالت غیر ہو گئی۔ جسم بخار سے پھنکنے لگا، لیکن کسی خدا کے بندے نے ہماری بات پر کان دھرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اُلٹا ہمیں کو طرح طرح کی باتوں پر کان دھرنا پڑا۔ کسی نے ہم پر بھوت کے سائے کا خدشہ بتایا تو کسی نے براہ راست ہمیں کو بھوت قرار دے دیا اور بعض رضاکار قسم کے پڑوسی تو آستینیں چڑھا چڑھا کر ہماری بیوی سے بھوت بھگانے کی اجازت بھی مانگتے رہے لیکن بھلا ہو شری ۱۰۸ سوامی جی مہاراج کا جنھوں نے جوابی تار ملتے ہی مطلع فرما دیا کہ یہ بھوت کا نہیں

"نوبدھی بارہ سدھی" نامی جنتر کی قیمت گیارہ روپے گیارہ آنے علاوہ محصول ڈاک مقرر کر رکھی تھی، اس حلف نامے کے ساتھ جنتر وی پی کرنے کی درخواست کردی کہ وی پی واپس کر کے ہم اور ہماری آنے والی نسلیں ہرگز پاپ کی بھاگی نہیں بنیں گی۔

شری ۱۰۸ اسوامی جی مہاراج کو ہم نے اس لئے جنتر وی پی کرنے کی درخواست نہیں کی تھی کہ اشتہار پڑھتے ہی ہم جنتر کے گیارہ سو گیارہ اوصاف پر ایمان لے آئے تھے یا اسی دن ہمارا کوئی عزیز گھر سے نکل بھاگا تھا، ہم کسی مقدمہ میں پھنس گئے تھے۔ یک بیک پوری دنیا ہماری دشمن ہو گئی تھی۔ یا خدا ناکردہ اس عمر میں ہم پر عاشقی کا بھوت سوار ہو گیا تھا اور ہم اپنے سنگدل محبوب کو اپنے قدموں میں لوٹتے دیکھنا چاہتے تھے۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ جوں کا توں تھا یہاں تک کہ بیوی اور اولاد کا بھی ہمیں پورا پورا سُکھ حاصل تھا۔ شری ۱۰۸ اسوامی جی کو اگر ہم نے جنتر وی پی کرنے کی زحمت دی تھی تو صرف ازراہِ تفنن یا یہ سمجھیے کہ ہم ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

کا عملی تجربہ کر کے دیکھنا چاہتے تھے۔

وی پی آیا۔ وی پی وصول کر لیا گیا۔ خیال تھا کہ گیارہ روپے گیارہ آنے کے مال میں سوامی جی نے ازراہِ عنایت ایسی کوئی چیز ضرور رکھ دی ہو گی جو بازار میں کم از کم گیارہ پیسے میں ضرور بک سکتی ہو پیتل تانبے کا کوئی ٹکڑا۔ رولڈ گولڈ یا اسٹین لیس اسٹیل کی چھوٹی موٹی انگوٹھی اور نہیں تو جنتر کو بازو یا ٹانگ پر باندھنے کے لئے ہاتھ بھر ریشمی دھاگہ تو ضرور ہو گا کہ کاغذ نتھی کرنے کے کام آسکے لیکن وی پی کھولنے پر انکشاف ہوا کہ سوامی جی کچّی گولیاں نہیں کھیلے۔ کاغذ کے انچ بھر ٹکڑے پر کچّی پنسل سے لکھی ہوئی جناتی قسم کی ایک تحریر بھیجی اور بس۔ ہاں پرچہ ترکیب استعمال کافی لمبا چوڑا اور باقاعدہ چھپا ہوا تھا۔

سُنانے کی بیماری

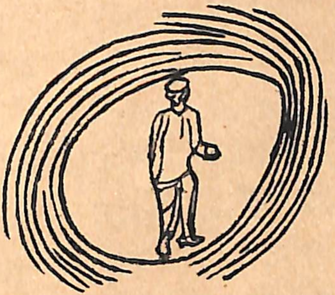
سائنس کی اس غیر معمولی ترقی کے زمانے میں کہا اور سُنا جاتا ہے کہ کوئی انسانی بیماری جسمانی یا ذہنی ایسی نہیں ہے جس کا علاج ممکن نہ ہو بلکہ آج کے سائنسداں تو اس کوشش میں ہیں کہ انسان کو مرنے ہی نہ دیا جائے۔ یا کم از کم وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی عمر کو طول دے سکے۔ خاکسار اِن سطور کے ذریعے دنیا کے بڑے سے بڑے سائنسداں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کی دریافت کردہ بیماری کا علاج بتائے۔ اور اگر واقعی اس بیماری کا علاج ممکن ہو گیا تو دنیا ملنے یا نہ ماننے خاکسار غیر مشروط طور پر اس بات کو تسلیم کرلے گا کہ سائنس انسان کو انسان کی مرضی کے خلاف بھی زندہ رکھ سکتی ہے۔

خاکسار کی دریافت کردہ بیماری کا نام تو — جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ بالکل معمولی یعنی 'سُنانے کی بیماری' ہے لیکن اس کے اثرات بہت غیر معمولی ہیں۔ اور یہ ایک ایسی پُراسرار بماری ہے جس کا شکار بیمار نہیں تیمار دار ہوتے ہیں۔ یہ بیماری بڑے بوڑھوں کو بھی ہوتی ہے جو آٹھوں پہر اپنی ناخلف اولاد کو فرمانبردار اور سعادت مند بنانے کے لئے نیک و بد پہ لیکچر جھاڑتے رہتے ہیں۔ لیکن

جنتر کے استعمال میں کسی خاص خامی کا نتیجہ ہے اور ہدایت فرمائی کہ جب تک اُن کا روانہ کردہ اکیس روپے اکیس پیسے کا خاص الخاص جنتر بذریعہ وی پی نہیں پہنچتا ہمیں بے شک کسی حکیم یا ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔

اس بات کو آج کئی مہینے ہو چلے ہیں۔ گڑی ہوئی دولت اور کھوئی ہوئی صحت ہاتھ آنے کے بجائے پہلے سے ہاتھ آئی یہ دونوں نعمتیں کمال صفائی سے ہمارے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہیں، کیونکہ ڈاکٹر صاحبان کے علاوہ شری ۱۰۸ سوامی جی کے وی پیوں کا بھی تانتا لگا ہوا ہے اور سوامی جی ہر وی پی کے ساتھ یہ آشیرباد لکھ بھیجتے ہیں کہ جوں ہی ایک بار پھر ہم رات کو سات بار نہانے اور جنتر کو ڈنڈوت پرنام کرنے کے قابل ہو جائیں گے ہمارے تمام روگ، تمام دکھ اس طرح مٹ جائیں گے کہ احساس تک باقی نہ رہے گا اور دولت ہاتھ نہ آئی تو جو چور کی سزا وہ شری ۱۰۸ سوامی بھبھوتی نند کی!

معلوم ہوتا ہے کہ بیوی نے کسی خط یا تار میں سوامی جی کو لکھ دیا ہے کہ ہماری زندگی دس ہزار کی بیمہ شدہ ہے۔



نہیں، آپ کے آبا و اجداد تک سے دور کا واسطہ نہیں۔ آپ تو ہائی کورٹ کے جج، اردن ہسپتال کے ڈاکٹر یا دریبہ کلاں کے صراف ہیں۔

"جی ہاں قبلہ غزل" جواب آتا ہے "بات یہ ہے کہ ابھی ابھی جب غزل مکمل ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ ٹیلیفون کے ڈائیل کو چھ مرتبہ گھماؤں گا اور جو نمبر بھی مل جائے گا اسی کو اپنی تازہ غزل سنا دوں گا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ عرض کیا ہے"

اور اس کے بعد عرض کا یہ لامتناہی سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک صبح نہ ہو جائے۔ یا آپ اپنی کور ذوقی کا ثبوت دیتے ہوئے ٹیلیفون نہ بند کر دیں۔ خاکسار کے تجربے کی بنا پر ٹیلیفون بند کرنے میں ٹیلیفون بند نہ کرنے کی نسبت زیادہ خطرہ ہے کیونکہ حضرتِ شاعر پر اس وقت سنانے کا دورہ پڑا ہوا ہے اور انھیں آپ کا ٹیلیفون نمبر بھی یاد ہو چکا ہے۔

دلی میں ایک ایسے بزرگ ادیب رائج الوقت ہیں جو حکومتِ ہند سے ایک ہزار سے اوپر مشاہرہ پاتے ہیں لیکن کنجوسی کا عالم یہ ہے کہ وہ بلا ناغہ کوئی نہ کوئی ایسا دوست ضرور پھانس لیتے ہیں جو اُن کا دفتر سے گھر تک کا بس کا کرایہ ادا کر دے۔ نوبت صرف بس کا کرایہ ادا کرنے تک رہتی تو ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے لئے کبھی کبھار خود خاکسار اپنے آپ کو پیش کر دیتا۔ لیکن ان کے ہتھے چڑھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو اپنے گھر لے جا کر اس وقت تک اپنی لافانی تخلیقات سُناتے رہیں گے جب تک کہ آپ کو غش نہ آ جائے یا جسمانی لحاظ سے آپ اتنے مضبوط نہ ہوں کہ سنانے سے قبل حفظِ ماتقدم کے طور پر ان کے بند کئے ہوئے کھڑکیاں، دروازے توڑ کر پچیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سرپٹ نہ بھاگ سکیں۔

خاکسار کے نزدیک اصل بیماری بڑے بوڑھوں یا شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی لڑکیوں کی ماؤں کو نہیں، اس مخلوق کو ہے جسے عام اصطلاح میں ادیب اور شاعر کہا جاتا ہے اور جس نے اِس بیماری کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا رکھے ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ پچھلے روز خاکسار راقم الحروف کسی انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں لپک جھپک چلا جا رہا تھا کہ ناگاہ اس کے کندھے پر اس زور سے دھول پڑی کہ وہ چکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اور اس سے پہلے کہ اس کے اوسان بجا ہوں ایک مردِ مجاہد جس کی شکل و صورت پر مرزا کا نہیں چوہے کا گمان ہوتا تھا اُسے گھسیٹتے ہوئے قریبی پارک میں لے گئے اور وجہ التفات بتائے بغیر اسی نیم بے ہوشی کے عالم میں چالیس صفحے کا ایک مضمون سُنا کر چلتے بنے۔

خیر اسے چھوڑئیے یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ خاکسار کو کوئی ضروری کام تھا اور اتفاق سے سُنانے کے مریض کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اب ذرا اس کے مہلک اثرات دیکھئے۔ رات کے گیارہ بارہ، ایک دو یا تین چار بجے کا عمل ہے۔ آپ بڑے اطمینان سے اپنے نرم و گرم بستر پر محوِ خوابِ خرگوش ہیں اور اس وقت اپنی عزیزہ بیوی سے لے کر وزیرِ اعظم تک کی خلل اندازی گوارا نہیں کر سکتے کہ ایکا ایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ہڑبڑا کر اور جھلا کر آپ چونگا اُٹھاتے ہیں اور دل ہی دل میں گالی دیتے ہیں کہ آگے سے آواز آتی ہے۔

"آداب عرض کرتا ہوں قبلہ"

"آداب" آپ نہایت مختصر جواب دیتے ہیں۔ "فرمائیے؟"

"اجی فرمانا کیا ہے حضرت! عرض یہ ہے کہ خاکسار نے ابھی ابھی ایک غزل مکمل کی ہے"

"غزل" آپ تعجب سے پوچھتے ہیں۔ کیونکہ غزل و نظم کا آپ ہی سے

تماشا

آپ میں سے جس کا جی چاہے، جس کے دل میں کوئی شک شبہ ہو، میرے پیٹ کو ٹھونک بجا کر دیکھ سکتا ہے۔ کوئی دھوکا کوئی فریب، کوئی مسمریزم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس کھیل میں ہاتھ کی صفائی اور آنکھ کی بینائی کا بھی کوئی کام نہیں۔ یہ کھیل ایک سیدھا سادا پیٹ کا کھیل ہے کوئی قدرت کا کھیل نہیں ہے کہ سالوں کی ریاضت کے بعد بھی سمجھ میں نہ آسکے۔

مہربان! آپ نے پیٹ کے پیٹھ میں جا لگنے کا محاورہ ضرور سنا ہوگا۔ لیکن آپ نے صرف محاورہ سنا ہوگا۔ تجربے کی نوبت کبھی نہ آئی ہوگی۔ آج آپ کے سامنے، آپ کے دیکھتے دیکھتے، میرا پیٹ میری پیٹھ سے جا لگے گا اور ایسا دکھائی دے گا، جیسے میرا پیٹ ہے ہی نہیں۔ لیکن دوستو یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ پیٹ ہے اور پیٹ بڑی بلا ہے اور ایسی بڑی بلا ہے کہ اس پر کوئی جادو ٹونا اثر نہیں کرتا۔ پچھلے دس سال سے میں پیٹ کو پیٹھ سے لگا رہا ہوں۔ لیکن آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ ابھی تک میں اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔

خود میرا باپ، جس سے میں نے یہ کرتب سیکھا تھا، پورے تیس برس تک

گزشتہ سنیچر کو خاکسار نے انھیں بڑی بیچارگی کی حالت میں دیکھا۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کا کوئی دوست نہیں تھا اور وہ بس میں بیٹھنے کے بجائے ایک تانگے والے سے کہہ رہے تھے "کیوں میاں ترکمان گیٹ تک جانے کا کیا کرایہ لوگے؟"

"سوا روپیہ حضور" تانگے والے نے جواب دیا۔

"دیکھو ہم تمہیں ڈیڑھ روپیہ دیں گے لیکن اس کے ساتھ ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا صاحب؟" تانگے والے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"راستے میں تمہیں ہمارا ایک افسانہ سننا پڑے گا۔"

یہ بیماری صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں بلکہ ایک عالمگیر بیماری ہے یہاں تک کہ پاکستان ایسا نوزائیدہ ملک بھی اس اعتبار سے کسی قدیم ترین ملک سے پیچھے نہیں بلکہ وہاں کے ایک حالیہ واقعے نے تو سائنسدانوں کے لئے کافی عبرت کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ شام کو سینما جاتے ہوئے چند لوگوں نے بیڈن روڈ لاہور پر ایک شاعر کو سر کی مالش کرواتے ہوئے دیکھا۔ اور ڈھائی گھنٹے کے بعد جب وہ لوگ سینما دیکھ کر واپس لوٹ رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ شاعر صاحب نے بڑی مضبوطی سے مالشئے کو پکڑ رکھا تھا اور مالش کروانے کے معاوضے کے طور پر لہک لہک کر اپنے شعر سنا رہے تھے۔

ہے دوستو! کہ آپ مجھے کبھی اتنے پیسے ہی نہیں دیتے کہ مجھے صرف دو گھنٹے کے لیئے پیٹ کو خالی رکھنا پڑے ———— خیر، جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ زمانہ ہی بدل چکا ہے۔ آج انعام دینے کی بجائے اگر کوئی گالی بھی دیدے تو بھی بڑی بات سمجھنی چاہیئے۔

دیکھیئے قدردان! اپنی جگہ مت چھوڑیئے۔ میں آپ سے کچھ مانگ نہیں رہا ہوں۔ کھیل دکھانے سے پہلے میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ اور اگر آپ چاہیں گے تو کھیل دکھانے کے بعد بھی میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ اور اس بے زبان بکرے اور اس تو پچی طوطے کو لے کر چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔ کوئی مجبوری نہیں ہے ——— ہاں، کھیل دکھانے سے پہلے میرے دوستو! میں آپ سے ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور آپ سے میری عرض یہ ہے کہ کھیل کے دوران میں کوئی شخص میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالے، کوئی آواز نہ نکالے، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اور میری طرف کوئی پیسہ ٹکہ نہ پھینکے۔ کیونکہ یہ کھیل بڑے جوکھم کا کھیل ہے۔ اور اس میں جان جانے کا خطرہ ہے۔

میرا باپ (خدا اُسے جنت نصیب کرے) ایک بار یہی کھیل دکھا رہا تھا کہ کسی سخی نے خوش ہو کر اس کی طرف ایک اکنی اُچھال دی۔ اُس زمانے میں ایک اکنی آپ جانتے ہیں آج کے ایک روپے سے زیادہ تھی۔ بیس سیر کا اناج تھا۔ اور ہمارے باپ کے اُستاد کے زمانے میں تو سُنا ہے، من ڈیڑھ من تک مل جاتا تھا ——— آج کل تو آدھا سیر بھی فطار باندھ کر ملتا ہے۔ اور وہ بھی آدھا تیتر آدھا بٹیر ——— تو قدردان! کسی سخی نے میرے باپ کے اس کھیل پہ خوش ہو کر ایک اکنی ٹھنکائی اور اس کی طرف اُچھال دی۔ زمین ڈھلوان تھی اور نیچے بدرو بہتی تھی۔ اکنی سیدھی بیٹھنے کے بجائے لُڑھکتی بل کھاتی

پیٹ کو پیٹھ سے لگاتا رہا۔ اور میرے باپ کا باپ، جس سے میرے باپ نے یہ ہنر سیکھا تھا۔ پورے بیسٹھ برس تک یہی مشق کرتا رہا ہے۔ اور میرے باپ کے باپ کا استاد بھی، جس نے ایک سو پندرہ برس کی عمر پائی تھی ۔۔ قدردان! ذرا غور فرمایئے۔ ایک سو پندرہ برس! اور ایک سو پندرہ برس کی عمر تک اس کی پوری بتیسی قائم تھی اور کمر مانند گھوڑے کے تھی اور آنکھ سانپ کی آنکھ کو مات کرتی تھی۔ اور ایک سو پندرہ برس کی عمر میں بھی وہ رسی پہ تھالی ٹکا کر جھولتا تھا ۔۔ اور قلابازیاں لگاتا تھا۔ اور لوگ دلی تک سے چل کے اس کے کرتب دیکھنے آتے تھے۔ ۔۔ قدردان! آخری عمر تک وہ بھی یہی مشق کرتا رہا۔ یعنی پیٹ کو پیٹھ سے لگاتا رہا لیکن عمر بھر کی مشق کے بعد جب وہ مرا تو صاحبان! بزرگوں کا کہنا ہے کہ اس کا پیٹ مشک کی طرح پھولا ہوا تھا اور اپنے آخری وقت میں اللہ کا نام لینے کی بجائے اس نے کھانے کو جلیبیاں مانگی تھیں۔

تو میرے مہربان بزرگو! میں کہہ رہا تھا کہ یہ کھیل ایک سیدھا سادہ پیٹ کا کھیل ہے اور میں نے اسے ورثے میں پایا ہے۔ لیکن یہ کھیل اتنا سیدھا سادہ بھی نہیں ہے کہ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اس کی مہارت کا دعویٰ کرنے لگے۔ دراصل یہ کھیل ہمارے خاندان کا خاص کھیل ہے اور ہم نے دسیوں جانیں گنوا کے اسے حاصل کیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مداری ہماری نقل کرتا ہے تو دوستو! آب آمد و تیمم برخاست یعنی اصل چیز کے سامنے اس کی نقل نہیں ٹھہر سکتی۔ نقل نقل ہے اور اصل اصل اور ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو نقل اور اصل کا فرق دکھاؤنگا۔

پیٹ کو پیٹھ سے لگانے کے لئے ضروری ہے قدردان کہ پیٹ خالی ہو، میرا پیٹ اس وقت بالکل خالی ہے۔ اور شرط حالانکہ صرف دو گھنٹے پہلے سے خالی رکھنے کی ہے، لیکن میں اسے بیس گھنٹے پہلے سے خالی رکھتا ہوں۔ اور سچ بات تو

کہہ دوں کہ اگر کسی نے کھیل کے دوران میں کوئی ہل جُل کی اور خدانخواستہ مجھے کچھ ہو گیا تو میرے کفن دفن کا انتظام اس کے ذمّے ہو گا۔

نہیں جناب! گھبرائیے نہیں۔ میں آپ پر اتنا بڑا بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ اور مجھے پردیس کی موت پسند بھی نہیں ہے۔ جی ہاں! میں یہاں پردیسی ہوں اور یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا اور میرا خیال ہے کہ یہاں میں بھی کسی کو نہیں جانتا۔ ہم لوگ پُشت ہا پُشت سے ریاست رام پور کے باشندے ہیں۔ میرا باپ، میرا دادا، میرا پردادا یعنی ہم سب دادے پوتے وہیں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور ہمیں وہیں کی مٹّی عزیز ہے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے، جو سُکھ اپنے چوبارے وہ بلخ نہ بخارے، لیکن اس نامراد پیٹ کو کیا کہئے مہربان! کہ آدمی کو دیس میں بھی پردیسی بنا دیتا ہے۔ میں جو دیس کو چھوڑ کر پردیس میں مارا مارا پھر رہا ہوں اور محلوں میں دکھانے کے کرتب یوں سرِ عام سڑکوں پر لُٹا رہا ہوں تو یہ مت سمجھئے کہ مجھے داد پانے کا چسکا ہے۔ گستاخی معاف ہو بزرگوار! داد ہمارے رام پور میں آج بھی بہت مل جاتی ہے اور ایسی ملتی ہے کہ کسی دوسری جگہ کیا ملے گی۔ لیکن قدردان! آج کل وہاں صرف داد ملتی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں، پیٹ بادشاہ کی داد سے بھی نہیں بھرتا۔ اور اسی ظالم پیٹ کی خاطر میں اپنے دیس اور اپنے بیوی بچّوں کو چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے، سب بات کھوٹی پہلے دال روٹی!

پھر وہی، آپ اس طرح کیوں کھسکتے ہیں دوستو! سیدھی طرح چھاتی تان کر چلے جائیے۔ میں نے آپ کی ٹانگوں میں کوئی رسی نہیں ڈال رکھی۔ آپ میرے مقروض نہیں ہیں، جو آنکھ بچانا چاہتے ہیں۔ میں آپ سے دس بار کہہ چکا ہوں حضور کہ ابھی میں آپ سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ باتیں بنا کر اور اپنے بیوی بچوں کا واسطہ دے کر پیسے اینٹھنا بھک منگوں کا کام ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں بھک منگا نہیں ہوں۔ حرام

بدرو کی طرف بڑھنے لگی۔ اُدھر پیٹ کے بیٹھ سے لگنے میں دو سُوت کی کسر تھی کہ میرا باپ بوکھلا اُٹھا اور بوکھلا کر اس نے اکتی کو جھپٹ لیا۔ اکتی تو اس نے جھپٹ لی مائی باپ لیکن آنتیں اس کی باہر نکل آئیں۔ اور وہ ایسا چکرا کے گرا کہ پھر کبھی اکتی نہ جھپٹ سکا۔

تو اے داتا لوگو! آپ سے میری عرض ہے کہ اس کھیل کے دَوران میں میری طرف کوئی پیسہ ٹکا مت پھینکئے، کوئی آواز مت نکالئے۔ میری آنکھوں میں آنکھیں مت ڈالئے۔ اور اپنی جگہ ست چھوڑئیے۔ ورنہ اس کھیل کے بجائے آپ کو کوئی اور کھیل نظر آئے گا۔ اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نئی زمانہ آدمی ہر طرح کا کھیل دیکھ سکتا ہے اور خوش ہو سکتا ہے لیکن آپ سے میری بار بار درخواست ہے کہ صرف اسی کھیل کو دیکھیے جسے میں اپنی مرضی سے دکھانا چاہتا ہوں اور سرِدست میری مرضی اپنی بیوی کو بیوہ اور اپنے بچوں کو یتیم کرنے کی نہیں ہے۔ — ہاں کھیل دکھانے کے بعد میں آپ کے کہے بغیر ہی آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں گا۔ اور اگر ضرورت پڑی اور میرا تجربہ ہے کہ ضرور ضرورت پڑے گی تو میرے ساتھ ساتھ یہ بے زبان بکرا اور یہ تو تیچی طوطا بھی طرح طرح کی آوازیں نکالیں گے اور یہ بکرا تو چاروں پنجے جوڑ کر آپ کو سلام بھی کرے گا۔ اس وقت اگر آپ چاہیں تو اپنی آل اولاد کے صدقے، اپنی حق حلال کی کمائی میں سے پیسہ دو پیسے ہم تابعداروں کے لئے بھی نکال دیں۔

دیکھئے مہربان! اگر آپ میں سے کوئی صاحب جانا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے جا سکتے ہیں بلکہ ان لوگوں سے تو میں خود ہی جانے کی درخواست کرتا ہوں جو اس اُمید سے یہاں کھڑے ہیں کہ شاید یہاں مقدمہ جیتنے یا معشوق کو مطیع کرنے کا تعویذ بٹے گا۔ دوستو! یہاں شُستی نامردی کی گولیاں بھی نہیں بٹیں گی۔ یہاں صرف پیٹ کو پیٹھ سے لگایا جائے گا۔ دیکھنا چاہیں شوق سے دیکھیں، نہ دیکھنا چاہیں شوق سے گھر کا راستہ پکڑیں۔ شاید بیوی جوتا لئے دہلیز پر کھڑی ہو۔ لیکن میں آپ سے ایک بار پھر

میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے دوستو! میری چھاتی پھٹ جاتی ہے جب مجھے اپنے بزرگوں کا خیال آتا ہے۔ کون ہے جو اپنے گھر میں نہیں رہنا چاہتا۔ کون ہے جسے در در کی ٹھوکریں کھانے میں لطف آتا ہو۔ ہر شخص حق حلال کی کمائی میں برکت سمجھتا ہے۔ اور کبھی محنت سے جی نہیں چراتا لیکن مجھے بتاؤ میرے یارو کہ محنت کے نام پر اگر اسے سیدھے کیلوں پر لیٹنا پڑے، کانچ چبانا اور انگاروں پر لوٹنا پڑے اور اس کے بعد بھی اسے پیٹ کو پیٹھ سے لگانے کی ضرورت محسوس ہو تو اس محنت سے کیا فائدہ۔ کیوں نہ آدمی اپنے بیوی بچوں کا گلا گھونٹ دے، ریل کی پٹری کے نیچے سر دیدے۔ یا کچھ کھا کے سو جائے —— لیکن مہربان! کچھ کھا کے سو جانا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ نے ایسے بہت سے واقعات سنے ہوں گے کہ کوئی شخص زندگی کے ہاتھوں تنگ آکر افیم کے ٹھیکے پر پہنچا، لیکن افیم کے بجائے اس نے جینا لے کر کھا لیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے مائی باپ کہ آدمی ہر حال میں جینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بیوی بچے زندہ رہیں۔ اِس نامراد پیٹ کی خاطر جسے ابھی آپ کے سامنے میں پیٹھ سے لگاؤں گا۔ وہ بندروں کی طرح قلابازیاں لگاتا ہے مینڈک اور گدھے کی بولی بولتا ہے اور ایسے ایسے کام کرتا ہے جنھیں شاید ریچھ اور لکڑ بگھے بھی اپنے لئے کسرِشان سمجھتے ہوں۔ لیکن اس پر بھی جب اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور وہ اپنے پیٹ کی دہائی دیتا ہے تو بادشاہ لوگ اسے جرائم پیشہ قرار دے دیتے ہیں اور کبھی شہر میں رات بسر نہیں کرنے دیتے۔ میں بالکل ان پڑھ، اُجڈ، گنوار ہوں —— قدردان! شاہوں بادشاہوں کی باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ شاید اس میں رعایا کی کوئی بھلائی ہی ہو کہ جرم نہ کرنے پر بھی ہمیں جرائم پیشہ سمجھا جائے لیکن ہمیں شہر میں کیوں نہیں رہنے دیا جاتا، اس بات کو میری موٹی عقل خوب سمجھتی ہے۔

لیکن نہیں، اے داتا لوگو! میں جو یہ واہی تباہی بک رہا ہوں۔ اس کا آپ

گی کمائی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ باتیں صرف وہ بناتے ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ میرے پاس ہُنر ہے اور مجھے اپنے ہُنر پر فخر ہے۔ میں کوئی ٹٹ پونجیا مداری نہیں ہوں کہ گولے اُچھال کر یا چھوٹے بڑے سانپ دکھا کر، سانپوں کے دودھ کے بہانے آپ سے بھیک مانگوں گا۔ میں آپ کو ایک ایسا کرتب دکھاؤں گا مہربان! جو آپ نے آج تک نہیں دیکھا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ آپ کے بزرگوں تک نے نہ دیکھا ہوگا۔

معاف فرمایئے حضرات! بزرگوں کے بارے میں میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے آپ کے بزرگ کبھی رام پور تشریف لے گئے ہوں اور کسی حیلے دربار میں بھی جا پہنچے ہوں۔ اس صورت میں بھلا میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے بھی یہ کرتب نہ دیکھا ہوگا جب کہ میرے بزرگوں کو اپنے کرتب دکھانے کے لیے آئے دن دربار میں طلب کیا جاتا تھا ــــ وقت وقت کی بات ہے قدردان! وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ بڑے بڑے شاہوں بادشاہوں کو وقت نے فقیر بنا دیا۔ وقت کے آگے بڑے بڑے گھمنڈی سورماؤں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وقت ایسی چیز ہے دوستو! جسے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ورنہ کبھی ہم نے بھی بہت اچھے دن دیکھے تھے۔ ہر روز پورا بکرا حلال ہوتا تھا۔ ہر چھٹے مہینے بھینس بدلتی تھی۔ اور کہنے کو تو ہم نیچ ذات کے لوگ ہیں اور ہمارا شمار جرائم پیشہ لوگوں میں ہوتا ہے۔ لیکن بڑے بڑے سیّد اور مغل دس چکر کاٹ کے ہمارے ڈیرے پر تمباکو پینے آتے تھے۔ اصلی لکھنوی مُشکی تمباکو پیتے تھے ہمارے بزرگ اور اسی شاہانہ ٹھاٹ کے انگرکھے اور دوپلی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ لیکن واہ رے میاں وقت ایک ہی ہلّے میں تم نے لکھنوی، کھیم پور ایک کر دیئے۔ سنکھیا، سوم سب برابر ہوگئے۔ اور آج ہمیں سونگھنے تک کو تمباکو نصیب نہیں ہوتا۔

قصّہ پانچویں درویش کا

پانچواں درویش کہ اب تک مارے نقاہت کے چت لیٹا تھا۔ اوّل دو زانو اور پھر چار زانو ہو بیٹھا اور اک آہِ جگر سوز کھینچ کے بولا ؎

یہ داستاں سُنانا تو ہے ایک لت سُنو
مرضی تمہاری چاہے سُنو چاہے مت سُنو
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
کس طرح اس فقیر کی بنتی ہے گت سُنو

اے یاران! یہ عاجز نہ تو بادشاہ زادہ فارس کے ملک کا ہے۔ نہ قبلہ گاہ اس حقیر کے امیرِ عجم کے تھے۔ اور راست پوچھو اور راست نہ بھی پوچھو جب بھی یہ کمترین راست سے باز نہ آئے گا کہ فارس، عجم، روم، یمن وغیرہم جو ولایتیں مرشدوں نے گنوائی ہیں وہ فدوی تو فدوی، فدوی کے مورثِ اعلیٰ تک نے کبھو دیکھیں نہ سنیں۔ فدوی کوئی سوداگر بچہ بھی نہیں کہ اول زر و جواہر کی ریل پیل ہو۔ اور اب ڈاکے کی مار کھا کے اور عشق میں لُٹ لٹا کے جنگل میں آن پڑا ہو۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بہت باتیں بنانی فقیر کو خوش نہیں آتیں۔

فقیر روزِ پیدائش سے فقیر ہے۔ فقر کے دولی نعمت بھی روزِ پیدائش سے فقیر تھے۔ اور یہ فقر و فاقہ روزِ اوّل سے فقیر کے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔ مدّعا فقیر کے سخن کا یہ

کچھ خیال نہ کیجئے۔ دراصل میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ پورے بیس گھنٹے سے جب آدمی کا پیٹ خالی ہو تو وہ اپنے ہوش میں نہیں رہتا۔ اور اسی طرح واہی تباہی بکنے لگتا ہے۔ آپ میری باتوں پہ نہ جائیے۔ میرا کرتب دیکھئے۔ بڑے جوکھم کا کرتب ہے مائی باپ۔ بڑی محنت مانگتا ہے۔ اس کڑاکے کے جاڑے میں بھی، جبکہ میں قریب قریب ننگا ہوں، آپ دیکھیں گے میں پسینے میں نہا جاؤں گا۔ آپ میرے جسم کی ایک ایک رگ گن سکیں گے۔ میری آنکھیں باہر ابل آئیں گی۔ اور میرے جسم میں جو تھوڑا بہت خون باقی ہے وہ سارے کا سارا میرے چہرے میں سمٹ آئے گا اور میری صورت دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے کہ یہ کوئی انسان کا بچہ ہے یا حیوان کی اولاد ——

اب چھوٹے بچے بیٹھ جائیں اور بڑے ایک ایک قدم پیچھے ہٹ جائیں۔ میری حالت غیر ہو رہی ہے۔ کھیل دکھانے سے پہلے ہی میری انتڑیاں پیچ رہی ہیں۔ خدانخواستہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو ہاتھ پیر ٹیکنے کے لئے کم سے کم دو گز زمین تو پاس ہو۔



اور عقل اور بھی چکرائی جب نفوسِ شہر کو بڑی بے رُخی کے ساتھ بغل سے نکلتے دیکھا۔ اوّل اوّل جو یہ نفس بغل سے نکلا وہ ایک مردِ بے ریش تھا کہ عبا و قبا کے بجائے نامانوس جامہ زیبِ تن کیے، دو پہیوں کی ایک عجیب سی کل پہ بیٹھا آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح نکل گیا اور نظر اس کمترین پہ نہ ڈالی۔ نظر اس کمترین پہ اُس مردِ خدا نے بھی نہ ڈالی جو مردِ بے ریش نہیں تھا جس کے بدن پر عبا و قبا بھی تھی اور سر پہ عمامہ بھی اور جو فقیر کی طرح پا پیادہ بھی تھا۔ ایک نہیں، دو نہیں، سینکڑوں نفوس آئے اور اندھا دھند نکل گئے۔ کیا مجال جو کسو نے چھوٹوں شفقت کی ہو اور مہمان داری کے ناتے ہی پوچھ لیا ہو کہ بول تیرے منھ میں کے دانت ہیں؟

اول خیال کیا کہ منھ اُٹھا کے داخل شہر میں ہو جاؤں اور واسطہ مہمانداری کا دے کے انتظام خورد و نوش اور تکیے کا کروں۔ پر پھر غلبہ دل پر خوف نے کیا کہ ان دیکھے شہر میں رات کو جانا خوب نہیں۔ یہ بات دل میں مقرر کر کے پتھر پیٹ پر باندھا اور سونا فصیل کے سائے تلے مناسب جانا کہ جب مرغ بولے گا رُخ اندر کا کروں گا۔ پر یارو سوچنے اور کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ خدا کو منظور اس بندے کا بے آب و دانہ پڑا رہنا نہ تھا یا واللہ اعلم کیا منظور تھا کہ کہیں سے ایک مردِ تنومند رونما ہوا کہ ہاتھ میں اس کے عصائے نصف تھا اور کمر کسی نامعلوم سی بات پہ کس کے باندھ رکھی تھی۔ کھانس کے، کھنکار کے اور غور سے میرے تئیں دیکھ کے بولا۔

"اے مردِ مسٹنڈے تو کون ہے، اور کیوں ہے؟"

'کون ہے'، کے جواب میں تو اس عاجز نے اپنا ماجرا بے کم و کاست کہہ سنایا۔ آنسوؤں کی جھڑی بھی باندھی۔ پر کیوں ہے کا جواب اس کم عقل سے نہ بن پڑا۔ بس یہ اُس مردِ تنومند نے اپنے عصائے نصف سے کمترین کی پسلی میں دو تین ٹھوکے دیئے اور بولا: بال بچوں والا ہوں اس لیے فقیر جان کے چھوڑے دیتا ہوں۔ ورنہ کوتوالی

ہے کہ فقیر آپ چاروں فقیروں کے مماثل نہیں. گستاخی معاف ہو، آپ صرف نام کے فقیر ہیں اور بندہ نام سے زیادہ دام کا فقیر ہے۔ دام کا فقیر نہ ہوتا تو بلخ بخارے کو ہیچ گردانتا۔ اور کہیں بھی چار اینٹ کا چوبارہ کھڑا کر کے بندگی اپنے معبود کی بجالاتا کہ حاجت اِس حقیر و ذلیل کو تخت و تاج کی تھی نہ منصب و معراج کی۔ دو ٹکڑے صبح و شام درکار تھے کہ قبلہ و کعبہ کی زندگی میں تو کسی طور نصیب ہوتے رہے۔ بعد ادھر ان کا وصال ہوا اُدھر قرض خواہوں نے ڈیوڑھی پکڑی۔ اپنا بیگانہ اس یتیم کا کوئی نہ تھا کہ آڑے آتا۔ کوٹھے میں نقد و جنس نہ تھی کہ قرضخواہ تسلّی پکڑتے۔ مارے رنج کے نڈھال تھا اور بھوک نقصان تن بدن کا کر رہی تھی۔ بہت سوچا، بہت غم کھایا۔ کوئی حیلہ پلّے نہ پڑا۔ آخرش جوانمردی کر کے ایک شب کو کہ آدھی اِدھر تھی آدھی اُدھر۔ رختِ سفر یعنی یہ گودڑ باندھا اور خدا پر توکّل کر کے پاپیادہ جدھر کو رُخ ہوا چل نکلا۔ چندے تغافل اور ہوتا تو پِٹ کے نکلتا۔ جانے کتے دن اور کتے راتیں منزلیں مارا کیں۔ پاؤں سوج کے پھوڑا ہو گئے۔ خاک صحراؤں کی چھان کے حلق پڑ گیا۔ کبھو کوئی جھڑبیری مل گئی تو بیر کھا کے جگالی کر لی۔ ورنہ نہار منھ لمبی تان دی سفر سے اور سفر کی صعوبتوں سے فقیر نہ گھبراتا۔ پر بزرگ بول گئے ہیں آدم آدم کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ عاجز بھی بہت جلد آدم کی صورت کو ترس گیا۔ جان، جسم مارے ناطاقتی کے ایک تھے، پر دو منزل کی ایک منزل۔ پھر تین منزل کی ایک منزل اور پھر نہ جانے کتے منزل کی ایک منزل کرنے لگا۔ بارے آبادی کے آثار دکھائی دیئے اور یہ عاجز سجدۂ شکر خدا کی درگاہ میں بجالایا۔

جب نزدیک اس شہر کی فصیل کے پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ پر یارو کیسی فصیل اور کیسی رات، دروازہ اُس شہر کا چوپٹ تھا۔ نہ کوئی دربان نہ نگہبان۔ اور رات تھی کہ دن کے اُجالے کو مات دیتی تھی۔ جا بجا تارے سے ٹنگے تھے کہ اصل تارے کیا کھا کے روشن ہوں گے۔ عقل بڑی چکرائی کہ الٰہی ایسا طلسماتی شہر تو کبھو دیکھا نہ کسو سے سنا۔

گنجائش پانی کی نہ رہی اور حلق تک آیا تو فقیر دعا دے کے آگے بڑھا۔ پر نہیں، فقیر آگے نہیں بڑھا۔ اس مردِ دریا دل نے فقیر کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ کٹورا بجا کے اور گودی میں ہاتھ دے کے بولا "نکال چہرہ شاہی!"

فقیر بہت حیران اور خاطر پریشان ہوا کہ یہ کیا مسخری کا مقام ہے۔ پانی کی قیمت وصول کرنا ہر مذہب میں حرام ہے۔ فقیر کا یہ وعظ سن کر ایک ہجوم در آیا کہ پہلے سے آمادہ نظر آتا تھا اور لعن طعن اس مشک باز کے بجائے فقیر پہ کرنے لگا کہ کدھر سے فصیل توڑ کے گھس آئے ہو۔ یہ پائے تخت اس ملک کا ہے۔ یہاں پانی تو پانی کلام تک بے دام نہیں ہوتا۔ یہ سن کے فقیر سخت شرمندہ ہوا اور نالہ و زاری اپنی کس مپرسی کی کرنے لگا کہ یہ تقصیر نادانستہ اس غلام سے ہو گئی کہ پانی پی گیا۔

میرا یہ بول سن کے ہجوم نے پہلے بغلیں جھانکیں۔ پھر بغلیں بجانے کا عمل کیا۔ یہ عمل نہ جانے کب تلک جاری رہتا اور فقیر نہ جانے کس کیفرِ کردار کو پہنچتا کہ ایک مردِ بزرگ کہ حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی مشکل کشائی کو اُترا۔ اپنے کھیسے سے ایک مدوّر کلدار نکال کے اُس مشک باز کو تھمایا اور مجھ کو بکر کے ہجوم کی نکال کے اپنی دوکان پہ لے گیا کہ کباڑ کی تھی۔ دوکان پہ لے جا کے اُس مردِ بزرگ نے گرم گرم قہوے سے تواضع میری کی۔ اور بملائمت بولا۔

"اے فرزند! یہ تو نے کیا حماقت کی کہ اپنے پاؤں سے گور میں آیا۔ کب کوئی شخص اس شہر میں بے دام آتا ہے؟"

کمترین نے ایک آہ نامرادی کی مار کے قصہ بے کسی اور مفلسی کا اپنا بیان کیا کہ چاروں کھونٹ میں سوائے مولا کی ذات کے اس یتیم کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ واں بھی زندہ در گور تھا، یاں بھی زندہ در گور ہوں۔ اتنی عنایت کی ہے اتنی اور کیجیے کہ کسو لائق ہو جاؤں۔ دو ٹکڑے حق حلال کے کما کے کھاؤں اور گن آپ کے گاؤں۔

لگاتا اور ساری چوریاں اُگلواتا!"

یہ بول کے اس جوانمرد نے شہر کی طرف اشارت کی کہ چلتا پھرتا نظر آ۔ فقیر موافق حکم اُس جوانمرد کے چلتا پھرتا نظر آنے لگا۔ ابھی چند قدم ہی چلتا پھرتا نظر آیا تھا کہ عاشق ہوتے ہوتے بچا۔ ایک معشوقِ خوبصورت کامنی سی مورت کہ نظر اس کے جمال پہ نہ ٹکتی تھی۔ اور دیکھے سے ہوش جانے اور دل سنسانے لگتا تھا، فقیر کا راستہ کاٹ گئی۔ اللہ بڑا کارساز ہے یارو! وگرنہ نظر اس کے جمال پہ ٹک جاتی تو فقیر اب تک وہیں پڑا ہوتا۔ اپنے تئیں بزور سمجھایا کہ دیارِ غیر میں بیک جست اور وہ بھی خالی پیٹ عاشق ہونا خوب نہیں کہ کوئی نام لیوا ہے نہ پانی دیوا۔ غش کھا گیا تو کوئی لخلخہ تک نہ سونگھائے گا۔

سڑک کہ جس پر فقیر چلتا پھرتا نظر آرہا تھا بڑی پختہ تھی اور صاف و شفاف ایسی کہ کہیں تنکا تک پڑا دکھائی نہ دیتا تھا۔ مرد و زن کا سیلاب تھا کہ زرق برق لباس پہنے اپنی دوڑ دوڑے چلا جاتا تھا۔ بیل گاڑیاں تھیں کہ بیلوں گھوڑوں کے بغیر سرپٹ تھیں۔ دورویہ فلک بوس خوش قطع عمارتیں اور شور اس زوروں کا کہ قیامت میں کیا برپا ہوگا۔ دل یہ دیکھ کے بڑا کبیدہ ہوا اور سوچ آئندہ کی ستانے لگی کہ اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔ اسی دلگیری میں بڑھا چلا جاتا تھا کہ مقابل ایک مسجد کے پہنچ گیا کہ گنبد جس کے آسمان کی خبر لاتے تھے اور ڈیل بے نظیر ہونے پر دلیل کرتا تھا۔ مسجد کو دیکھ کے یاد خدا کی آئی۔ سوچا دو رکعت نفل پڑھ کے وہیں چٹائی پہ پڑ رہوں گا۔ اور صبح بمقدور اپنے کچھ تلاش کام کی اور کچھ سبیل طعام کی کروں گا۔ کہ کان میں آواز کٹورا بجنے کی آئی۔ دیکھا کئی مردِ خدا مشکیں کندھے سے لٹکائے کٹورے بجا بجا کے اور راہگیروں کو روک روک کے پانی پلا رہے ہیں اور ثواب کما رہے ہیں۔ دیکھ کے جیبھ مارے پیاس کے چٹخنے لگی اور بھوک نے بھی عود کیا۔ بڑھ کے ایک پیالہ آب کی فرمائش ایک مشک باز سے کی۔ آب کیا تھا، برفاب تھا خوب سیر ہو کے پیا۔ وہ مردِ دریا دل بھی تا بڑ توڑ کٹورے بھر بھر کے دیتا رہا۔ جب پیٹ میں مزید

کو بڑی شفقت سے خوابِ خرگوش سے جگا کے اور منہ ہاتھ دھلوا کے اس مردِ مہربان نے ایسی زودہ آور نہاری کھلائی کہ سبحان اللہ! بائیس برس کی سوکھی ہڈیاں تر ہو گئیں۔ شکن جلد کے تن گئے اور ڈکار پہ ڈکار آنے لگی۔ اس پر وہ مردِ مہربان کہ پہلی گھڑی سے فدوی کو فرزند بول بیٹھا تھا، بولا۔

"یہ غذائیں اور میوے خشک وغیرہ بلاناغہ کھانے کو ملیں گے، پان تمباکو اور لوازم دوسرے بھی میسّر آئیں گے۔ پر خبردار جو کسو کو کانوں کان خبر ہو کہ تو کیا کسب کرتا ہے۔ کیوں کرتا ہے اور کس کے لئے کرتا ہے؟"

فدوی نے ہاتھ چھاتی پہ رکھ کے عہد کیا کہ آزمائش شرط ہے، تس پہ اُس مردِ خردمند نے ایک آلہ فولاد کا عاجز کے ہاتھ میں دیا کہ رنچ کہلاتا تھا اور کچھ ٹکڑے عجب قطع کے کباڑ کے ڈھیر سے اُٹھا کے دکھائے کہ بخوبی غور کر لے۔ اِس رنچ سے ایسی ڈھبریاں اور نٹ بجھے کھڑے موٹروں سے اُتار اُتار کے لانے ہیں۔

اس بے وقوف کے پلّے اس مردِ خردمند کی بات ترت نہ پڑی۔ فدوی کا چہرہ سپاٹ دیکھ کے اُس نے کھول کے سمجھایا اور گُر کام کے بتائے اور بیٹھے ٹھونک کے حق نمک کا ادا کرنے کو کہا۔ فقیر مطابق اُس کے حکم کے کیل کانٹے یعنی اس آلۂ فولاد سے لیس ہو کے روانہ کام پہ ہوا کہ مردِ خردمند کو کام پسند تھا، چام نہیں۔ بے بیل کے چھکڑے وہاں موٹر کہلاتے تھے اور یہ افراط پائے جاتے تھے۔ ایسا بائیں ہاتھ کا کرتب اور کھانے انواع و اقسام کے۔ اور صحت اس مردِ بزرگ کی پا کے گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی اس عاجز کے ہاتھ لگی۔

غائت درجہ خوش و خورسند چلا جا رہا تھا کہ دائیں ہاتھ ایک خوش وضع موٹر آپ ہی آپ آ رکا۔ اور دعوت اِس کارکن کو بائیں ہاتھ کا کرتب دکھانے کی دینے لگا۔ فقیر کمر کس کے اور لپک کے نمک حلال اپنے آقا کا کیا چاہتا تھا کہ جیسے ایک دم سنّاٹا مار گیا۔

بہ لیاقت کا جواب سیر اس کے اس مرد خردمند نے تبسم کیا اور بولا۔

"فن سوداگری کا جانتے ہو؟"

اس مجبور و معذور نے معذوری ظاہر کی کہ 'نہیں'۔

"کھاتہ، روزنامچہ سیکھا ہے؟"

"نہیں"

"کسب سپاہ گری کا تو ضرور ہاتھ میں ہوگا؟"

اس پر فقیر نے ساتھ تفصیل کے شجرۂ اپنے خاندان کا گوش گزار کیا کہ آبا و اجداد اس فرزند کے جنگ و جدال سے سخت نفرت کھاتے تھے اور اس واماں فدوی کی گھٹی میں پڑا ہے۔ کبھی تک نصیب میں نہیں آیا۔

یہ سنتے ہی وہ مرد خردمند اپنی نشست سے گز بھر اچھلا اور مجھ سے لپٹ لپٹ کے بولا۔

"واجب! بالکل واجب! مجھ کو تیرے جیسے مرد بے ریا کی تلاش برسوں سے تھی۔ آخر آج تو مل گیا!"

فدوی نے سر تسلیم خم کر کے اور ہاتھ باندھ کے التماس کیا کہ غلام سے جو خدمت حضور کی ہو سکے گی بسر و چشم بجا لائے گا اور بخوبی دیانتداری و ہوشیاری سے انجام دے گا۔

فرمایا کہ تو ابھی لڑکا ہے۔ اس واسطے بار بار تاکید کرتا ہوں۔ مبادا خیانت کرے اور آفت میں پڑے۔

فدوی نے خدا کو حاضر ناظر گردانا کہ ایمان وہی اپنے بندوں کا رکھتا ہے۔ غرض اچھی طرح سے ٹھونک بجا کے جب اُس مرد خردمند نے مجھے لائق اپنے کام کے جانا تو کمال دریا دلی سے کھانا کھلایا۔ ایک سے ایک مرغن طعام تھا۔ شاہی قورمہ، پسندے، بریانی، کباب شامی بھی اور سیخ کے بھی۔ القصہ وہ سب تھا جو فقیر نے آج تک خواب میں بھی نہ چکھا تھا۔ ایسا چھک کے کھایا کہ صبح تک پڑا خراٹے لیا کئے۔ جب آفتاب سوا نیزے بلند ہوا تو فقیر

اس درویش کا قلمبند کر کے بولا "کیا یہ سچ ہے کہ تو موٹروں کی ڈھبریاں اور نٹ اُتارنے کا کاروبار کرتا ہے؟"

فقیر نے اقرار کیا اور آلہ فولاد کا کہ رینچ کہلاتا تھا بطور ثبوت خدمت میں پیش کیا۔

"کیا یہ سچ ہے؟" کوتوالِ شہر دوبارہ بولا "کہ اب تلک تو سینکڑوں موٹروں کی ڈھبریاں اور نٹ اُتار اُتار کے منڈی میں فروخت کر چکا ہے؟"

درویش نے اقرار نہ کیا۔ کہ سارے ڈبل میں زبان حلال ہے اور دروغ گوئی نزدیک اس درویش کے سخت حرام!

"کیا یہ سچ ہے" کوتوالِ شہر نے بالآخر وہ سوال کیا جس کا جواب دینے کو عاجز ترس رہا تھا "کہ تو اس نازنین پر عاشق ہو گیا ہے؟"

درویش نے بصد عجز و نیاز اقرار کیا کہ جی جان سے عاشق ہوں اور جب تلک یہ زمین و آسمان برپا ہیں عاشق رہوں گا!"

"ٹھیک ہے!" کوتوالِ شہر نکاح پڑھانے کے انداز میں بڑی ملائمت کے ساتھ بولا۔ "باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ اوّل یہ بتا کہ تیرے چاروں ساتھی یعنی پہلے کے چہار درویش مفرور ہو کے کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

اس سوالِ غیر متعلقہ پر اے درویشو! اس بندۂ بے خطا کی تکرار اس کوتوالِ شہر سے ہو گئی۔ وہ سمجھے کہ درویش خدانہ کردہ دروغ گوئی برتتا ہے۔ اور درویش کو تمام چہار درویشوں کی مطلق خبر نہ تھی کہ عاشق ہو ہو کے اس باغ و بہار میں چھپے بیٹھے ہو ورنہ درویش کبھی کوڑے نہ کھاتا۔ قید دو سال کی بامشقت نہ کاٹتا اور ثبوت گواہ وعدہ معاف بن کے اور نکاح اُس حور سے کر کے ڈھبریاں اور نٹ موٹروں کے اتارتا اور اپنی عاقبت سنوارتا۔

ایک زن کہ موٹر سے بھی خوش وضع تھی، موٹر سے نکلی اور جھلک اپنے رُخِ روشن کی دکھا کے اور کوئی کل موٹر کی سیدھی کر کے پھر موٹر میں بیٹھ گئی۔

چندے توقف ہوتا تو آزاد فقیر کو عمر بھر کا دُکھ دے کے نو دو گیارہ ہو جاتی۔ پر فقیر نے توقف نہ کیا جھپٹ کے سلام اس گلبدن کو کر کے بولا "بے مہری اِس قدر معشوقوں کو زیب نہیں آتی۔ رُخ اپنا جم کے دکھائیے کہ فقیر کی خاطر جمع ہو اور پھر دہنِ مبارک سے فیصل فرمائیے کہ اوّل عاشق ہوؤں یا ڈھبریاں اور نٹ ڈھیلے کروں؟"

دوستو! اِس کے آگے مت پوچھئے کہ کیا ہوا؟ زبان اُس کے بیان سے قاصر ہے کہ کس طرح اُس کافر ادا نے پٹ موٹر کا کھول کے مقام فقیر کو اپنی بغل میں دیا۔ اور پھر کے اُس اُڑن کھٹولے میں لے اُڑی۔ مارے مسرّت کے فقیر اُچھل اُچھل پڑتا تھا اور وہ پری دلاسہ دے دے کے تھامتی تھی کہ بڑی جستجو کے بعد ہاتھ لگے ہو۔ اب نہیں چھوڑوں گی کب عاشق ایسا میرا اور میرے موٹر کا ہاتھ آتا ہے۔ ہائے ہائے کیا شیریں گفتار اُس پری کی تھی کہ غنچہ دل کا شگفتہ ہو گیا۔ ترت پیغام نکاح کا دیا کہ نیک کام میں دیر خوب نہیں۔ اور گزارش قاضیِ شہر کے پاس چلنے کی کی۔

وہ زنِ مہربان متبسم ہو کے بولی۔

"خاطر جمع رکھ کہ میں تیرے کہے وہیں چلتی ہوں۔ یہاں قاضی نہیں کوتوالِ شہر نکاح پڑھاتا ہے۔"

کوتوالِ شہر جیسا کہ کوتوالِ شہر ہوتے ہیں بالکل کوتوالِ شہر تھا میری کیفیت کو وقوف سے جان کے بولا "کچھ کہنا منظور ہو تو کہہ گزر! بعد کو رنج نہ کیجیو!"

فقیر نے برجستہ بیت پڑھی ؎

بشر راز دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے | نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گل بیکار ہوتا ہے

فقیر کا یہ جواب برجستہ سن کے کوتوالِ شہر بہت محظوظ ہوا اور حسب نسب

غیر سرکاری اور بھرپور سرکاری والنٹیر آزادی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر پاکستان بھجوایا جا رہا تھا۔ اُن کے گھروں کا سامان اونے پونے خریدا یا لوٹا جا رہا تھا اور اُن کے مکانوں کی پگڑیاں وصول کی جا رہی تھیں پہلے دو دن ایک سرائے میں کٹ گئے۔ قسمت میں پانڈوؤں، مغل شہنشاہوں، انگریز وائسرائے کا گریسی نیتاؤں اور اشتہاری حکیموں کے دارالخلافہ کی رونق بڑھانا لکھا تھا کہ تیسرے دن جب مانند سندباد جہازی کے میری نظریں آسمان پر تھیں اور میں گاندھی گراؤنڈ میں کھڑا آسمان میں اڑانیں بھرتے ہوئے اور امن و آشتی کے اشتہاروں کی بوندا باندی کرتے ہوئے طیاروں کا نظارہ کر رہا تھا اور تعریف اُس خدا کی کر رہا تھا جس نے جہاں بنایا، ایسی زمیں بنائی یہ آسماں بنایا کہ اچانک فرشتہ صورت فرشتہ سیرت ایک رشتہ دار سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ ہنس ہنس کر قصۂ غم بیان کیا، وہ رو رو کر اور لپٹ لپٹ کر خدا کا شکر بجالائے کہ اب سب بانسے سیدھے پڑیں گے اور مجھے اور میرے بیوی بچوں کو اپنے یہاں اُٹھا لے گئے۔

جس محلے میں وہ رہتے تھے، اس کا نام نیا محلہ تھا لیکن دراصل وہ کوئی نیا محلہ نہ تھا بلکہ بہت عرصہ پہلے اُسے مسلمان بھٹیاروں اور کنجڑوں نے آباد کیا تھا۔ بھٹیاروں اور کنجڑوں کے آباد ہونے سے پہلے وہاں ایک وسیع و عریض باغ تھا جس میں ارنڈ طلیعنی ہرنولی کے بیشمار درخت تھے اور وہ ارنڈی کا باغ کہلاتا تھا۔ ارنڈی کے باغ نے نئے محلے کی شکل اختیار کرتے کرتے کتنے چولے تبدیل کئے، اس کے صحیح اعداد و شمار تو مجھے معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ حکیم معصوم علی دہلوی نے جو اس محلے کا سب سے قدیم باشندہ سمجھا جاتا تھا اور جو حکمت کے ساتھ ساتھ بانجھ اور ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو گنڈے اور تعویذ دیتا تھا اور بچوں کو قرآن مجید کی آیتیں رٹاتا تھا، لیکن اب جس نے قرآن مجید کو لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا تھا اور محلے کے نئے باسیوں کو آوازیں دے دے کر اُن کی آنکھوں میں نورانی سرمے کی سلائیاں پھیرتا تھا اور اپنی مہندی رنگی داڑھی اور لب ترشی مونچھوں

دلّی ہے ایک شہر

جب میں نے دلّی کا رُخ کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ کوئی شوقیہ یا اتفاقیہ بات نہ تھی اور اب یہ بھی کوئی شوقیہ یا اتفاقیہ بات نہیں ہے کہ پچھلے دس برس سے کہ جب سے میں دلّی میں آباد ہوں، ہمارا میاں بیوی کا رشتہ بہن بھائی کے رشتے میں تبدیل ہو چکا ہے!

آگے چل کر میں میاں بیوی اور بہن بھائی کے رشتے کا فرق بتاؤں گا، آگے چلنے سے پہلے ہی میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے اس قسم کی توقع بیکار ہے۔ یہ فرق جاننے کے لئے آپ منو مہاراج کی منوسمرتی کا مطالعہ کیجیے جس کا ترجمہ لاطینی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ تمام مہذب زبانوں میں موجود ہے۔ دھرم کرم کی باتوں سے ہٹ کر میں یہاں صرف دلّی میں اپنے دس برس کے قیام کا ذکر کروں گا۔

ان دس برسوں سے پہلے کے پانچ برسوں میں یعنی آزادی ملنے کے بعد کے پانچ برسوں میں میں نے لدھیانہ، ڈیرہ بابا نانک، الہ آباد، سیتاپور اور بمبئی میں اپنے آپ کو کھپانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ڈیرہ بابا نانک اور سیتاپور میں مکان ملا لیکن کام نہ ملا۔ لدھیانہ اور الہ آباد میں کام ملا لیکن مکان نہ ملا اور بمبئی میں نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم! جو چند ٹکے ہاتھ میں تھے وہ بھی نکل گئے لہٰذا دلّی کا رُخ کرنے کا فیصلہ کیا کہ جس کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہے۔

یہ وہ دن تھے جب ہندو مسلم فسادات کے بعد ہندو مسلم کھینچا تانی جنم لے رہی تھی۔

رکھے بھی جا چکے ہیں۔

"ہندو تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے۔" شری یت مُرلی منوہر، جو اس محلے کے رکشا دل کے منتری مقرر ہوئے تھے، آدھی رات کے وقت کمالِ بے تکلفی سے ایک مسلمان کے گھر کا سامان اُٹھا اُٹھا کر گلی میں پھینک رہے تھے۔

"ہندو تمہارا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں گے۔"

"ہندو ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔" شور واویلا سن کر میں اپنے رشتہ دار کے محل نما مکان سے نکل کر وہاں پہنچا۔

"مارے جوتوں کے ہندو تمہارا بخیہ اُدھیڑ ڈالیں گے۔" انھوں نے میرے دھاری دار تہبند سے میرے مسلمان ہونے کا اندازہ لگایا۔

"ہندو ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔" میں نے گلی میں کھڑے دس ایک مسکین صورت مسلمانوں کی طرف دیکھ کر دُہرایا۔ جس میں سے نہ جانے کس بدبخت کے منہ سے نکل گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں!

"تم کون ہو جی؟" شری یت مرلی منوہر نے آپے سے باہر ہو کر ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے لکڑی کے بنگوڑے کو زمین پر پٹک دیا۔ اور مجھے گلے سے آ دبوچا۔

"میں ہندو ہوں۔"

"تم ہندو نہیں ہو۔"

"میں اُلو کا پٹھا ہوں۔"

"تم ہندو نہیں ہو۔"

"میں گدھے کا بچہ ہوں۔"

انھوں نے جلال میں آ کر میرے پیٹ میں گھونسا مارا، منہ پر تھپڑ اور میرا گریبان چاک کر دیا۔ اور مجھے گھسیٹتے ہوئے مقامی تھانے میں لے گئے اور وہاں یہ بیان دے کر

میں مسلسل مسکراتا تھا، مجھے بتایا کہ لفظ رانڈھی کا الف مقصورہ کثرتِ استعمال سے ٹوٹتے ٹوٹتے ہمیشہ کے لئے گر گیا اور رانڈھی کا باغ پہلے رنڈھی کے باغ میں اور پھر رنڈھی کے محلے میں تبدیل ہو گیا۔

رنڈھی کے محلے کو پنجابی برادری کے مسلمانوں نے نئے محلے کا نام دیا۔ کیونکہ کنجڑوں اور بھٹیاروں نے مغل زمانے کے ہندو جاگیرداروں کی بغل میں رنڈھی کا محلہ آباد کر کے ایک فاش غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ ہندو جاگیرداروں کو بھلا بھٹیاروں اور کنجڑوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ بلیماران اور پھاٹک حبش خاں کے مسلمان نوابوں کی طرح بٹیر باز، مرغ باز، کنکوے باز اور رنڈی باز تھے اور ایک ایسا محلہ جو لفظ رنڈی کی توہین کرتا ہو اور جس میں چھم چھماتی رنڈیوں کے بجائے دن بھر پھاڑ بھونکنے اور گلا پھاڑ کر ٹکے سیر ٹکے سیر چلانے والے بھٹیارے اور کنجڑے آباد ہوں، انھیں بھلا رنڈی کے نام پہ مر مٹنے والے جاگیردار کیسے برداشت کرتے۔

انھوں نے بھٹیاروں اور کنجڑوں کو برداشت نہ کیا لیکن انھیں پنجابی برادری کے مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا۔ پنجابی برادری کے تاجر بچے ان کی ٹکر کے تھے۔ انھوں نے بڑی بڑی عالیشان عمارتیں کھڑی کیں اور کہتے ہیں کہ بعد ازاں ان تاجر بچوں نے دیوالیہ جاگیرداروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جس کی تاب نہ لا کر بھٹیارے اور کنجڑے جاگیرداروں کی آل اولاد کو دعائیں دیتے ہوئے کہیں اور اٹھ گئے تھے۔

لیکن آزادی کے بعد اب کچھ ایک مسلمان گھرانوں کو چھوڑ کر، جن کی حالت معصوم علی دہلوی کی طرح اسم بامسمی تھی، محلے بھر میں مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ سے آئے ہوئے ہندو سکھ شرنارتھی آباد تھے اور مجھے تعجب ہوا کہ ابھی تک انھیں اس محلے کا نام بدلنے کا خیال کیوں نہیں آیا تھا —— محلہ سردار برچھا سنگھ، محلہ لالہ دودھا دھاری مل، کالی کلکتے والی کا محلہ —— دسیوں نام تھے جو رکھے جا سکتے تھے اور جو دسیوں شہروں میں

اور دو گواہیاں دلوا کر کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکاتا ہوں دنگا کرتا ہوں اور پاکستان خفیہ خبریں پہنچاتا ہوں، انھوں نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔

ہندو تھانیدار نے کہ ہندوستان کا بہت ہی خیر خواہ معلوم ہوتا تھا، مجھے ماں کی گالی دی سپاہی کو حکم دے کر میرے چوتڑوں پر بید لگوائے اور رات بھر کبھی مرغ بننے اور کبھی ایک ٹانگ پر کھڑا رہنے کی سزا دی۔ یہ سزا دوسرے دن کے لئے بھی تھی۔ شاید تیسرے اور چوتھے دن کے لئے بھی لیکن صبح جو آنکھ تھانے دار صاحب کی کھلی تو عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی۔ یعنی شری یت مُرلی منوہر نے تھانے میں آکر پہلے تھانیدار صاحب سے اور پھر مجھ سے معافی مانگی اور مجھے مسلمان سمجھنے اور اس وجہ سے میری ہڈی پسلی ایک کر دینے پر افسوس کا اظہار کیا اور مجھے بخیر و عافیت رہا کروا دیا۔

اب جو واپس محلے میں پہنچا تو ایک عجیب ہی منظر نظر نواز ہوا۔ رشتے دار بہادر کہ فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت تھے، تیسری سہانی صبح ہی چنڈال صورت نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا والمیکی رامائن کے میگھناد کو کسی نے کچی نیند سے جگا دیا تھا اور اس کی گرجنا، بادل کی کڑک اور بجلی کی تڑپ سے بازی لگا رہی تھی ـــ اور میری بیوی کہ محل میں قدم رکھتے ہی کنگھی چوٹی اور بچّوں کو نہلانے دھلانے اور چومنے چاٹنے میں مصروف ہو گئی تھی، پریشان زلف بندھے ہوئے بستر پر بیٹھی بچوں کو بے تحاشہ گالیاں دے رہی تھی اور بچے پاس پڑے ہوئے ٹرنکوں کے علیگڑھی تالوں سے اندروں کی گھنٹیوں کا کام لے رہے تھے۔

اس کوچے کا نام کوچہ قابل عطار تھا اور اگرچہ پورے کوچے میں کسی بچے بوڑھے یا جوان کی شکل عطار نامی مخلوق سے نہیں ملتی تھی اور عرق سونف یا عرق گاؤزباں کی خوشبو سونگھنے کے لئے لال کنواں سے ورے کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر بھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہر چیز کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی بدعت ترک کر دوں گا۔ پھر میری بیوی